کشمیر میں عربی شعر و ادب کی تاریخ

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر

کشمیر میں عربی شعر و ادب

از

ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری

بی۔ اے (آنرز) مولوی فاضل

ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی (علیگڈھ)

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر کشمیر

۱۹۹۳ء

عرضِ ناشر

کشمیر کی خاک سے زعفران کے ساتھ ساتھ علم وادب کے غنچہ زار بھی برجستہ اُگ
رہے ہیں۔ شاید اسی لئے بانیٔ مسلمانی حضرت امیر کبیرؒ نے اسے عجائبات کی سرزمین یعنی "باغِ س
کہہ کر پکارا ہے۔ اور علامہ اقبالؒ نے اپنے آسمانی سفر "جاوید نامہ" میں اس خصوصیت پر انگشت
ہو کر لکھا تھا ع اے کہ از طبعِ تو کشتِ گل دمید

کشمیری نے سنسکرت میں لکھا تو اپنے من کے معدن سے نکالے ہوئے لال و گہ
وہ انبار لگائے کہ دنیا کی آنکھیں آج بھی اُن کی چمک سے خیرہ ہو رہی ہیں۔ پارسی سرائی کا زمانہ آیا تو
عجم میں "سیہ چشمانِ کشمیری" کی دھاک بٹھا دی۔ لسان القرآن میں بھلا اُس کے کمالات کب
زمانے کی نگاہوں سے چھپے رہتے۔ ۱۱۳۵ھ میں کشمیر میں لکھے گئے قرآن مجید نسخہ فتح اللہ الکشمیری ن
اُفق کی ایسی توسیع اور ترصیع کی ہے کہ یہ کارنامہ دیکھ کر یہ مصرع یاد آتا ہے ع

کوکبے چوں شاہدے بالائے بام

یہ نسخہ ایک ایسے رسمِ خط میں لکھا گیا ہے جو عربی رسمِ خط کے ارتقاء کی ایک نادر کڑی ہے۔ جب کو ف
بعد ایک کم مرصع مگر زیادہ واضح رسمِ خط وضع کرنے کی مشق جاری تھی تو خطِ بہاری نے ایک اہم
کی حیثیت سے درمیانی پُل کا کام دیا۔ اس خط میں کوفی اور نسخ دونوں کے کچھ خصائص مشترک ہیں
ہر لفظ آج کی انگریزی کی طرح الگ الگ اور فاصلہ چھوڑ کے لکھا جاتا ہے۔ یہ خط چند سو سال ہی
رہا اور اس کی بہت کم مثالیں موجود ہیں۔ کتنا حسین اتفاق ہے کہ ایک ایسا نایاب جواہر پارہ کشمیر میں ل

عرضِ ناشر

کشمیر کی خاک سے زعفران کے ساتھ ساتھ علم وادب کے غنچہ زار بھی برجستہ اُگتے رہے ہیں۔ شاید اسی لئے بانیٔ مسلمانی حضرت امیر کبیرؒ نے اسے عجائبات کی سرزمین یعنی "باغِ سلیمان" کہہ کر پکارا ہے۔ اور علامہ اقبالؒ نے اپنے آسمانی سفر "جاوید نامہ" میں اس خصوصیت پر انگشت بدنداں ہوکر لکھا تھا ع

اے کہ از طبعِ تو کشتِ گُل دمید

کشمیری نے سنسکرت میں لکھا تو اپنے من کے معدن سے نکالے ہوئے لال وگُہر کے وہ انبار لگائے کہ دُنیا کی آنکھیں آج بھی اُن کی چمک سے خیرہ ہورہی ہیں۔ پارسی سرائی کا زمانہ آیا تو سارے عجم میں "سیہ چشمانِ کشمیری" کی دھاک بٹھادی۔ لسان القرآن میں بھلا اُس کے کمالات کب تک زمانے کی نگاہوں سے چھپے رہتے۔ ۱۱۳۵ھ میں کشمیر میں لکھے گئے قرآن مجید نسخہ فتح اللہ الکشمیری نے اِس اُفق کی ایسی توسیع اور ترصیع کی ہے کہ یہ کارنامہ دیکھ کر یہ مصرع یاد آتا ہے ع

کو کبے چوں شاہدے بالائے بام

یہ نسخہ ایک ایسے رسمِ خط میں لکھا گیا ہے جو عربی رسمِ خط کے ارتقاء کی ایک نادر کڑی ہے۔ جب کوفی کے بعد ایک کم مرصع مگر زیادہ واضح رسمِ خط وضع کرنے کی مشق جاری تھی تو خطِ بہاری نے ایک اہم تجربے کی حیثیت سے درمیانی پُل کا کام دیا۔ اس خط میں کوفی اور نسخ دونوں کے کچھ خصائص مُشترک ہیں مگر ہر لفظ آج کی انگریزی کی طرح الگ الگ اور فاصلہ چھوڑ کے لکھا جاتا ہے۔ یہ خط چند سو سال ہی رائج رہا اور اس کی بہت کم مثالیں موجود ہیں۔ کیتنا حسین اتفاق ہے کہ ایک ایسا نایاب جواہر پارہ کشمیر میں ایک

…کی ترویج کی۔ آج بھی سری نگر کے مزارِ کلان، مزارِ سلاطین اور سیّد مح…
…کے نہایت پاکیزہ نمونے نظر آتے ہیں۔ کشمیر کی تہذیب و ثقافت کے…
…کچھ کم نہیں ہیں جس کا فاضل مصنف نے اچھا خاصا ذکر کیا ہے۔ رسول…
…سے اپنے کلام کو اس سلیقے سے مزیّن اور منوّر کرتا ہے کہ اُس کے عبورِ قرآن…
…نے اشارہ کیا ہے کہ مولانا سُلیمان ندوی داؤد مشکوٰتی کی "اسرار الا…
…کرتے ہیں۔ میں اس سلسلے کے ایک اور واقعے کو درج کرنا مفید سمجھتا ہو…
…"تعمیر" نام کے رسالے کا مدیر تھا تو اُس کے ایک شمارے میں صاحبزادہ حسن ش…
…"اسرار الابرار" کا تفصیلی سا ذکر تھا۔ کسی طرح سے یہ شمارہ مولانا ابوالکلام آ…
…سے گذرا۔ چنانچہ انہوں نے اُس وقت کے وزیرِ اعظم بخشی غلام محمد کو خ…
…نسخہ بھجوانے کی تاکید کی۔ چنانچہ راقم الحروف نے خصوصی ہدایات پر محکمہ…
…وزیرِ اعظم تک پہنچایا جنہوں نے اسے مولانا آزاد کی خدمت میں بھیج دیا۔…
کرنے کے بعد اسے واپس بھیج دیا۔

…مُصنّف نے کتاب میں لکھا ہے کہ کشمیر اور شرع کے اعداد برابر…

…اب "آروٹھ" کہلاتا ہے۔ اب یہ بات ثابت ہے کہ پان اسلام ازم کے عظیم رہبر جمال الد…
…سری نگر آئے جہاں انہوں نے ایک نانبائی کے یہاں جو اُن دنوں ہوٹل کا کام دیت…
…تو انہیں جلاوطن ہو کر پیرس سے اپنے مقاصد کی ترویج کے لئے ایک رسالہ نکال…
…یہ رسالہ دنیائے اسلام میں اتحاد کی اذان ثابت ہوا۔ اور کیا معلوم کہ افغانی کے…
دوران "عروۃ الوثقیٰ" کا نام سُن کر ہی آیا ہو؟

…مشق کتنے سو سال
…کے مطابق قرآنِ
…شمیری کا ترجمہ اس
…ف توجہ کریں تو یہ
…تے۔ اسی طرح اب
…منصور حلاج کشمیر
"THE PASSIO…
…شمیر میں شہمیری حکمرانو…
…س عربی نام ہے
…اطاعت کا اعلان
…تند رسمِ خط یعنی نسخ

…ادا اپنے والد کے نام
…جاز کے مقاماتِ مقدسہ
…سم چراغ تھا (تاریخ حکو…

(م۔ی۔ٹ)

…نادِ زمانہ سے منکسر ہو کر
(اگلے صفحہ پر)

کی ترویج کی۔ آج بھی سری نگر کے مزارِ کلان، مزارِ سلاطین اور سید محمد مدنی کی مسجد و مزار پر نستعلیق خط کے نہایت پاکیزہ نمونے نظر آتے ہیں۔ کشمیر کی تہذیب و ثقافت کے علاوہ کشمیری ادب پر بھی عربی کے اثرات کچھ کم نہیں ہیں جس کا فاضل مصنف نے اچھا خاصا ذکر کیا ہے۔ رسول میر جیسا رومانی شاعر بھی قرآن حکیم کی آیات سے اپنے کلام کو اس سلیقے سے مزین اور منور کرتا ہے کہ اُس کے عبورِ قرآن پر عش عش کرنا پڑتی ہے۔ فاضل مصنف نے اشارہ کیا ہے کہ مولانا سلیمان ندوی داود مشکوٰتی کی "اسرار الابرار" کو حدیث کی کتابوں میں شمار کرتے ہیں۔ میں اس سلسلے کے ایک اور واقعے کو درج کرنا مفید سمجھتا ہوں۔ جب راقم الحروف سرینگر کے "تعمیر" نام کے رسالے کا مدیر تھا تو اُس کے ایک شمارے میں صاحبزادہ حسن شاہ کا ایک مضمون شایع ہوا جسمیں "اسرار الابرار" کا تفصیلی سا ذکر تھا۔ کسی طرح سے یہ شمارہ مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیمات ہندوستان کی نظر سے گذرا۔ چنانچہ انہوں نے اُس وقت کے وزیرِ اعظم بخشی غلام محمد کو خصوصی طور پر ٹیلی فون کر کے اس کا قلمی نسخہ بھجوانے کی تاکید کی۔ چنانچہ راقم الحروف نے خصوصی ہدایات پر محکمہ ریسرچ سے اس کا نسخہ حاصل کر کے وزیرِ اعظم تک پہنچایا جنہوں نے اسے مولانا آزاد کی خدمت میں بھیجدیا۔ جنہوں نے کئی مہینے اس کا مطالعہ کرنے کے بعد اسے واپس بھیج دیا۔

مصنف نے کتاب میں لکھا ہے کہ کشمیر اور شرع کے اعداد برابر ہیں۔ شاید وہ جلدی میں اس حسن

اب "آروٹھ" کہلاتا ہے۔ اب یہ بات ثابت ہے کہ پان اسلام ازم کے عظیم رہبر جمال الدین افغانی پچھلی صدی کے ربع آخر میں سری نگر آئے جہاں انہوں نے ایک نانبائی کے یہاں جو اُن دنوں ہوٹل کا کام دیتے تھے قیام کیا۔ جب وہ واپس چلے گئے تو انہیں جلاوطن ہو کر پیرس سے اپنے مقاصد کی ترویج کے لئے ایک رسالہ نکالنا پڑا جس کا نام "عروۃ الوثقیٰ" ہی رکھا گیا یہ رسالہ دنیائے اسلام میں اتحاد کی اذان ثابت ہوا۔ اور کیا معلوم کہ افغانی کے ذہن میں یہ نام سری نگر کے قیام کے دوران "عروۃ الوثقیٰ" کا نام سن کر ہی آیا ہو؟

بسمِ اللهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

پیش لفظ

کشمیر مختلف زمانوں میں مختلف مذاہب اور متنوّع ثقافتوں کا مرکز رہا ہے جس کے نتیجے میں یہاں مختلف زبانوں کو پنپنے اور علوم فنون کے میدان میں ترقی کرنے کا موقعہ ملا۔ پندرہویں صدی عیسوی میں یہاں اسلام پھیلا تو فارسی زبان اور فارسی علوم وفنون نے سنسکرت کی جگہ لے لی اور بہت جلد فارسی لٹریچر کو شعروادب، تاریخ وتراجم، طِب ونجوم اور سب سے بڑھکر علم تصوّف کے میدانوں میں مالا مال کیا۔

اگرچہ اسلام کی ترویج واشاعت سے عربی لٹریچر ہی کی آبیاری ہونے چاہیئے تھی — کیونکہ اسلام کا فکری اور علمی سرچشمہ قرآن حکیم اور پیغمبر اسلام صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مقدس احادیث ہیں جو دونوں اصلاً عربی میں ہیں — جبکہ اس کے برخلاف مسلمانوں کی توجہ فارسی کی جانب رہی اور عربی زبان بہت پیچھے رہی مگر اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ کشمیر میں اسلام کی کامیاب تبلیغ واشاعت اُن مُبلّغین کرام کی مساعی جمیلہ سے ممکن ہوئی کہ جن میں سے اکثر وبیشتر "عجم" سے تعلق رکھتے اور جن کی عام بول چال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

کشمیر مختلف زمانوں میں مختلف مذاہب اور متنوع ثقافتوں کا مرکز رہا ہے جس کے نتیجے میں یہاں مختلف زبانوں کو پنپنے اور علوم فنون کے میدان میں ترقی کرنے کا موقعہ ملا۔ پندرہویں صدی عیسوی میں یہاں اسلام پھیلا تو فارسی زبان اور فارسی علوم و فنون نے سنسکرت کی جگہ لے لی اور بہت جلد فارسی لٹریچر کو شعروادب، تاریخ و تراجم، طب و نجوم اور سب سے بڑھکر علم تصوّف کے میدانوں میں مالامال کیا۔

اگرچہ اسلام کی ترویج و اشاعت سے عربی لٹریچر ہی کی آبیاری ہونے چاہیے تھی — کیونکہ اسلام کا فکری اور علمی سرچشمہ قرآنِ حکیم اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس احادیث ہیں جو دونوں اصلاً عربی میں ہیں — جبکہ اس کے برخلاف مسلمانوں کی توجہ فارسی کی جانب رہی اور عربی زبان بہت پیچھے رہی مگر اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ کشمیر میں اسلام کی کامیاب تبلیغ و اشاعت اُن مبلغینِ کرام کی مساعی جمیلہ سے ممکن ہوئی جن میں سے اکثر و بیشتر "عجم" سے تعلق رکھتے اور جن کی عام بول چال

علمی خدمات کے بارے میں تردّد ہوتا ہے مگر اب جبکہ دورِ ظلمت کے گہرے اثرات آہستہ آہستہ فنا ہوتے جارہے ہیں اِس سے تاریخ کشمیر کے بہت سے تاریک گوشے روشن اور نمایاں ہونے لگے ہیں۔ مختلف افراد اور اداروں کی مسلسل کوششوں سے بہت سے گمنام علماء کا عظیم الشان علمی سرمایہ منظرِ عام پر آنا شروع ہوا ہے جو آج تک گرد و غبار کی تہ بہ تہ غلاف میں مستور تھا، اِس گرد کو جھاڑنے میں سُرعت لانے کی اور زیادہ ضرورت ہے۔

خاکسار مؤلف نے عربی علوم و فنون میں علمائے کشمیر کی خدمات اُجاگر کرنے کا جو سلسلہ آج سے پندرہ سال پہلے شروع کیا تھا، پیشِ نظر کتاب اسی سلسلے کی چوتھی کڑی ہے۔ موجودہ حصّے کو صرف شعر و ادب کے ساتھ مخصوص رکھا گیا اور ہمیں اعتراف ہے کہ اِس میدان میں کشمیر کا حصّہ قدرے ہلکا ہے، تاہم جب ایک علیحدہ اور مستقل کڑی کے بجائے ایک مربوط سلسلے کے جُز کے طور پر اس کا مطالعہ کیا جائے گا تو اس کی قدر و قیمت میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوگی۔

مؤلف ریاست جموں و کشمیر کی کلچرل اکادمی کا تہِ دِل سے شُکر گزار ہے جس نے اِس مختصر سی علمی خدمت کی طباعت و اشاعت کی ذمہ داری قبول کر کے نہ صرف اس کو ایک کٹھن مرحلے سے سبکدوش کیا بلکہ یک گونہ اِس کی عزت افزائی بھی کی، خاکسار مؤلف اکادمی کے فعّال سربراہ جناب محمد یوسف صاحب ٹینگ کا خاص طور سے شُکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے جنہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اس کتاب کا مطالعہ کیا اور خطوط کے ذریعہ اس کی ایسی حوصلہ افزائی کی جو مؤلف اور

علمی خدمات کے بارے میں تردّد ہوتا ہے مگر اب جبکہ دورِ ظلمت کے گہرے اثرات آہستہ آہستہ فنا ہوتے جارہے ہیں اِس سے تاریخ کشمیر کے بہت سے تاریک گوشے روشن اور نمایاں ہونے لگے ہیں۔ مختلف افراد اور اداروں کی مسلسل کوششوں سے بہت سے گمنام علماء کا عظیم الشان علمی سرمایہ منظرِ عام پر آنا شروع ہوا ہے جو آج تک گرد و غبار کی تہہ بہ تہہ غلاف میں مستور تھا، اِس گرد کو جھاڑنے میں سُرعت لانے کی اور زیادہ ضرورت ہے۔

خاکسار مؤلف نے عربی علوم و فنون میں علمائے کشمیر کی خدمات اُجاگر کرنے کا جو سلسلہ آج سے پندرہ سال پہلے شروع کیا تھا، پیشِ نظر کتاب اسی سلسلے کی چوتھی کڑی ہے۔ موجودہ حصّے کو صرف شعر و ادب کے ساتھ مخصوص رکھا گیا اور ہمیں اعتراف ہے کہ اِس میدان میں کشمیر کا حصّہ قدرے ہلکا ہے، تاہم جب ایک علیحدہ اور مستقل کڑی کے بجائے ایک مربوط سلسلے کے جزُ کے طور پر اس کا مطالعہ کیا جائے گا تو اس کی قدر و قیمت میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوگی۔

مؤلف ریاست جموں و کشمیر کی کلچرل اکادمی کا تہہِ دل سے شکر گزار ہے جس نے اِس مختصر سی علمی خدمت کی طباعت و اشاعت کی ذمہ داری قبول کر کے نہ صرف اس کو ایک کٹھن مرحلے سے سبکدوش کیا بلکہ یک گونہ اِس کی عزت افزائی بھی کی، خاکسار مؤلف اکادمی کے فعّال سربراہ جناب محمد یوسف صاحب ٹینگ کا خاص طور سے شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے جنہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اس کتاب کا مطالعہ کیا اور خطوط کے ذریعہ اس کی ایسی حوصلہ افزائی کی جو مؤلف اور

عربی زبان کی فطری مقبولیت

عربی زبان کی فصاحت و بلاغت، تعبیری صلاحیت اور مواد کی کثرت جاہلی دور میں بھی مسلّم تھی، پھر جب قرآنِ حکیم نازل ہوا تو اس نے عربی زبان و بیان کو ایک مستقل معجزے کا مقام بخشا، جس کے سامنے بڑے سے بڑے شاعر، مسلم الثبوت خطیب اور مشہور و ممتاز ساحر و کاہن کا سحر و افسوں بے وقعت ثابت ہوا۔ چنانچہ مسلمان جہاں بھی پہنچے وہاں اُنہوں نے غیر مسلموں کو اپنی زبان سے بھی بے حد متأثر کیا۔ رومیوں نے یونانی اور لاطینی زبانوں کو بھلا دیا اور اہل فارس نے ژند اور اوستا سے اپنا رشتہ توڑ دیا۔ ڈوزی نے ہسپانیہ کے قدیم باشندوں کے بارے میں لکھا ہے کہ جب وہاں مسلمان داخل ہوئے تو یہاں کے باشندے، جن میں نوجوان طبقہ پیش پیش تھا، عربی زبان و ادب کی طرف اس طرح راغب ہوئے کہ وہاں کے اُس وقت کے ایک پادری نے کھل کر یہ شکایت کی کہ اب لوگوں نے عربی شعر و ادب، فلسفہ اور مذہب کا مطالعہ صرف عربی میں کرنا پسند کیا ہے اِس طرح اپنے اسلاف کی زبان (لاطینی) کا مذاق اُڑا کر اُسے بھلا ہی دیا ہے[1] جن شدید قوم پرستوں نے عربوں کی سیاسی بالادستی کبھی دل سے تسلیم نہیں کی تھی اُنہوں نے بھی عرب سیاستدانوں کا مقابلہ عربی زبان ہی کے اسلحہ سے کیا۔ ایک مرتبہ مشہور شاعر متوکلی نے خلیفہ متوکل کے بھرے دربار میں کہا:۔

---

[1] تاریخ العرب فی اُسبانیا ج ۲ ص ۱۰۳

عربی زبان کی فطری مقبولیت

عربی زبان کی فصاحت و بلاغت، تعبیری صلاحیت اور مواد کی کثرت جاہلی دور میں بھی مسلّم تھی، پھر جب قرآنِ حکیم نازل ہوا تو اس نے عربی زبان و بیان کو ایک مستقل معجزے کا مقام بخشا، جس کے سامنے بڑے سے بڑے شاعر، مسلم الثبوت خطیب اور مشہور و ممتاز ساحر و کاہن کا سحر و افسوں بے وقعت ثابت ہوا۔ چنانچہ مسلمان جہاں بھی پہنچے وہاں اُنہوں نے غیر مسلموں کو اپنی زبان سے بھی بے حد متأثر کیا۔ رومیوں نے یونانی اور لاطینی زبانوں کو بھلا دیا اور اہل فارس نے ژند اور اوستا سے اپنا رشتہ توڑ دیا۔ ڈوزی نے ہسپانیہ کے قدیم باشندوں کے بارے میں لکھا ہے کہ جب وہاں مسلمان داخل ہوئے تو یہاں کے باشندے، جن میں نوجوان طبقہ پیش پیش تھا، عربی زبان و ادب کی طرف اس طرح راغب ہوئے کہ وہاں کے اُس وقت کے ایک پادری نے کھل کر یہ شکایت کی کہ اب لوگوں نے عربی شعر و ادب، فلسفہ اور مذہب کا مطالعہ صرف عربی میں کرنا پسند کیا ہے اس طرح اپنے اسلاف کی زبان (لاطینی) کا مذاق اُڑا کر اُسے بھلا ہی دیا ہے[1] جن شدید قوم پرستوں نے عربوں کی سیاسی بالادستی کبھی دل سے تسلیم نہیں کی تھی اُنہوں نے بھی عرب سیاستدانوں کا مقابلہ عربی زبان ہی کے اسلحہ سے کیا۔ ایک مرتبہ مشہور شاعر متوکلی نے خلیفہ متوکل کے بھرے دربار میں کہا:-

---

[1] تاریخ العرب فی اُسبانیا ج ۲ ص ۱۰۳

انا ابن المکارم من نسل جم | زارث ملوک العجم
وطالب أوتارهم جهرۃً | فمن نام عن حقهم لم انم
معی علم الکابیان الذی | بہ أرتجی أن اسود الأمم
فقل لبنی ھاشم اجمعین | ھلموا الی الخلع قبل الندم
فعودوا الی أرضکم بالحجاز | لاکل الضباب ودعی الغنم
فانی ساعلوا سریر الملوک | بحد الحسام وحرف القلم[1]

(میں جمشید کی نسل سے تعلق رکھتا ہوں اور اس پر فخر کرتا ہوں کہ میں عربوں کو چھوڑ کر سلاطینِ عجم کی میراث اکٹھا کر رہا ہوں۔ میں ان کا بدلہ لینے کا آرزو مند ہوں، اگر کوئی ان کا حق ڈھونڈنے سے غافل ہو گیا تو ہونے دو، مگر میں خاموش نہیں رہوں گا، میرے ساتھ دُرفشِ کاویانی ہے اسی سے مجھے قوموں پر حکومت کے لئے ہمت اور حوصلہ ملتا ہے۔ تم سارے عربوں کو میری طرف سے خبردار کرو کہ پشیمان ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے نکل کر حکومت سے دست بردار ہو جاؤ۔ انہیں سوسمار کھانے اور ریوڑ چرانے کے لئے حجاز[2] کی طرف لوٹنا چاہیئے، جو ان کا وطن ہے۔ میں بہت جلد تلوار کی دھار اور قلم کے نوک پر سلاطین کے تخت و تاج پر قابض ہونے والا ہوں)۔

---

[1] معجم الأدباء: یاقوت الحموی الرومی: ج ۱ ص ۳۲۳

[2] یہی وہ مشہور طنز و طعن ہے جو اہلِ فارس عربوں کو دیا کرتے تھے، اسی کو فردوسی نے بھی اپنے مخصوص اسلوب میں شاہنامہ میں دہرایا ہے ؎

زشیر و شتر خوردن سوسمار | عرب را بجائے رسید است کار
کہ تختِ کیاں را کنند آرزو | تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

یہی حال بشار بن برد، حماد عجرد، یحییٰ بن زیاد، والبہ بن العباب وغیرہ شعراء کا تھا[1]۔ مگر ظاہر ہے کہ اِس قومی غرور کے اظہار کے لئے بھی اِن شعرائ نے عربی زبان ہی کو ترجیح دی تھی۔ یہ گویا اِس حقیقت کا اعتراف تھا کہ عربی زبان کی عظمت و شوکت کے آگے دُرفش کاویانی ہر صورت میں پست ہے۔ ٹھیک یہی صورت حال کشمیر میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ برہمن زادہ مؤرخ جونراج نے، جو میر سیّد محمد ہمدانیؒ (فرزند میر سیّد علی ہمدانیؒ) کا معاصر تھا۔ "ملیچھوں" کی ناپاکی اور ان سے کشمیر کی سرزمین آلودہ ہونے پر گہرے دُکھ کا اظہار کیا ہے، مگر غیر شعوری طور پر عربی و فارسی کے بہت سے الفاظ اور اصطلاحات اپنی منظوم سنسکرت تاریخ میں درج کیے ہیں۔

---

[1] ان کی اس قسم کی قومی نخوت اور وطنی تعصّب کے لئے ابو الفرج الاصفہانی کی کتاب الأغانی جلد سوم کا مطالعہ کیا جائے۔

ہندوستان میں عربی علوم کی اشاعت

سرزمین عرب میں ابتدائی دور کے خلفاء اور سلاطین دین و علم کی اشاعت و ترویج کو اپنا فرضِ منصبی سمجھتے تھے اور مفتوحہ ممالک کو مساجد و مدارس کے قیام و پھیلاؤ سے استحکام بخشتے تھے، اور تو اور بنی اُمیہ کے بدنام زمانہ جلاد گورنر حجاج بن یوسف ثقفی کے بارے میں تاریخوں میں مذکور ہے کہ اُس نے اپنے بھتیجے محمد بن قاسم ثقفی کو سندھ فتح کرنے کے زمانے میں ایک خط میں یہ ہدایت دی تھی کہ اپنی فتوحات کا دائرہ زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے کی کوشش کرو اور بڑے اور پرانے شہر میں مساجد تعمیر کیا کرو۔[1] سلطان محمود غزنوی نے کشمیر کے جن جن درّوں پر اپنی کامیابی کے جھنڈے نصب کئے وہاں مسجدیں بھی تعمیر کرائیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسجدوں ہی سے درسگاہوں، تربیتی اداروں اور تصنیف و تالیف کے مراکز کا کام بھی لیا جاتا تھا۔

ہندوستان میں سب سے پہلے جو خطّہ عربی دینی علوم کا مرکز بن گیا وہ سندھ تھا جو منصورہ اور دیبل کے نام سے بھی مشہور تھا۔ یہاں تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوّف کے ذخائر منتقل ہوئے جو عربی علوم کے اوّلین سرچشمے ہیں۔ سندھ کے بعد پنجاب اُس وقت علم اور علما، کا مرکز بن گیا جب وسط ایشیائی

---

[1] فتوح البلدان: ابو الحسن البلاذری: ص ۴۴۰

فاتحین نے ہندوستان کی طرف رُخ کیا۔ ملتان (جو پہلے ہی اسلامی فکر اور دینی تعلیمات سے متعارف اور متاثر ہو چکا تھا) اور لاہور علومِ عربیہ کی گرم بازاری میں سبقت لے گئے، اِس کے بعد جب سلطان معزّ الدین غوری نے پرتھوی راج چوہان کو فیصلہ کُن شکست دے کر دلی میں سلطنتِ اسلامیہ کی بنیاد ڈال دی تو دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان اِسلامی علوم و فنون کا گہوارہ بن گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شرقِ اوسط میں علم و دانش کے مشہورِ روزگار دانشکدے بڑی تیزی کے ساتھ زوال اور انحطاط کے مراحل سے گُزر رہے تھے علماء اور اربابِ فنون کو پیٹ پالنے کے لیے اربابِ سیاست کے آگے جبہ سائی کرنا پڑتی تھی یا جو ذرائع و وسائل نہ رکھنے کی بِنا پر ایسا نہ کر پاتے تھے وہ ایک نوالہ کے لئے ترستے تھے۔ چند علماء اور فخرِ روزگار دانشوروں کے حالات یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

مؤرخ ابن خلکان نے ایک عالم عبدالوہاب مالکی کے بارے میں لکھا ہے کہ جب بیحد تنگ دست ہوئے تو بغداد ہی سے رخصت ہوئے جس دن نکلے تو رفقاء اور شاگردوں نے کُچھ فاصلے تک مشایعت کی۔ موصوف نے اُن سے کہا اگر مجھے ہر دن صبح کے وقت صرف دو ہی روٹیاں میسّر ہوتیں تو بغداد سے کبھی رخصت نہ ہوتا۔ جب مصر پہنچے تو وہاں وارد ہوتے ہی ان کی عزّت افزائی ہوئی، مگر پہلے ہی دن جب ان کے سامنے انہی کا پسندیدہ کھانا رکھا گیا تو ابھی پہلا لقمہ حلق سے اُترا بھی نہ تھا کہ موت کی آغوش میں پہنچ گئے۔ کروٹ بدلتے ہی اُن کی زبان پر یہ الفاظ تھے:-

لا اله الّا اللّٰہ اذا عشنا متنا[1]

تعجب ہے کہ جب ہم جینے کی تمنّا کرتے ہیں تو مر جاتے ہیں۔
چوٹی کے فلسفی اور یونانی علوم کے متبحّر عالم ابو سلیمان منطقی (جو دانشوروں کی مشہور زیر زمین جماعت اخوان الصّفا میں سے اکثر سابقون کے COMRADES کے اُستاد تھے، مگر تھے نابینا) کے بارے میں اُن کے شاگرد ابو حیّان توحیدی نے لکھا ہے کہ وہ اپنا پیٹ پالنے اور ایک کمرہ کرایہ پر لینے سے عاجز اور قاصر تھے[1]۔ ابو علی القالی (جن کے بارے میں علامہ ابن خلدون نے اپنے مقدمۂ تاریخ میں لکھا ہے کہ وہ عربی علوم اور زبان و بیان کے چار ممتاز ترین ماہروں میں سے ایک تھے) اُندلس جانے سے پہلے اپنی ایک پسندیدہ کتاب بیچنے پر مجبور ہوئے تھے۔ شاعر اور فقیہہ اَبیوَردی اتنے مفلس ہوئے تھے کہ دو سال تک ٹھنڈے موسم میں گرم کپڑا نصیب نہ ہوا۔ وہ دوستوں اور شاگردوں سے کہتے تھے کہ میں ایسی بیماری میں مُبتلا ہوں جو مجھے جبّہ پہننے سے روکتی ہے، یہ بیماری فقر و افلاس کی بیماری تھی[2]۔ خطیب زکریا تبریزی (جو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح کے عربی زبان و ادب میں اُستاد تھے) کو ایک تحقیقی کام کے مقصد سے معرّۃ النعمان (شام) جانے کی ضرورت پڑی جہاں انہیں نامور نابینا فلسفی اور ادیب ابو العلا المعرّیؔ سے علمی مدد حاصل کرنا تھی۔ لمبی مسافت طے کرنے کی غرض سے خطیب زکریّا کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ سوار ہو کر جاتے۔ لاچار کتاب

---

[1] الامتاع والمؤانسۃ بحوالہ ظُہرُ الاسلام ج ۱ ص ۱۱۷

[2] ایضاً ص ۱۱۹

(جو کئی جلدوں پر پھیلی ہوئی تھی) کندھے پر اُٹھائی اور چل دئے۔ راستے میں پسینے سے اس قدر شرابور ہوئے کہ کتاب بھی داغدار ہوگئی[1]۔ موصل کے ایک سرکردہ عالم ابوالعباس الخباز اپنی مالی بدحالی کے واقعات بیان کرنے سے گریز کرتے تھے تاہم دو شعروں میں کہا ہے کہ اگر یہ واقعات بیان کروں تو پہاڑ ہل جائیں گے، آگ بجھ جائے گی، پانی رُک جائے گا، لوگ زندہ نہیں رہینگے، زمانہ نہیں رہے گا، آفتاب طلوع نہیں ہوگا اور تارے ساکت ہوجائینگے[2]۔

اِن واقعات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عرب ممالک میں علماء، شعراء، ادباٗ اور ماہرینِ فنون کی حالت کیا سے کیا ہوگئی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے انہی دنوں مسلمانوں کے لئے یہ پورا نیم براعظم کھول دیا۔ یہاں پانچ سو سال تک یکے بعد دیگرے ایسے جلیل القدر سلاطین برسرِ اقتدار آئے جنہیں اپنے دین و مذہب پر فخر تھا اور جنہوں نے علماء اور باصلاحیت مسلمانوں کو اپنے درباروں کی آبرو قرار دیا۔ ہندوستان کا چپہ چپہ ترکستان، کرمان، خراسان، طبرستان اور آذربائیجان کے ہزاروں علماء، صوفیاٗ، شعراء اور ماہرینِ فنون سے معمور ہوا۔ غلامان، خلجی، غوری، تغلق اور لودھی سلاطین نے ان پر خزائن و دفائن نچھاور کئے جن کے ثمرات و نتائج ہزاروں بادِسموم گزرنے کے باوصف آج بھی زندہ ہیں اور انشاء اللہ ہمیشہ تابندہ رہیں گے۔

---

[1] بحوالہ ظُہرُ الاسلام

[2] اِس قسم کے رونگٹے کھڑے کرنے والے واقعات اور اُن کے تجزیہ و تحلیل کیلئے ڈاکٹر امین احمد مصری مرحوم کی مشہورِ روزگار تصنیف ظُہرُ الاسلام کی چاروں جلدیں مطالعہ کی جائیں:۔

کشمیر میں عربی علوم کا داخلہ اور ترویج و اشاعت

کشمیر میں داخلہ اسلام' اشاعتِ اسلام اور اقتدارِ اسلام جیسے موضوعات نے اُلجھنوں کو جنم دیا ہے تینوں موضوعات ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ عقیدتمندانہ غلو، قومی نخوت اور نام نہاد روشن خیالی نے صحیح تاریخی واقعات پر تہ بہ تہ پردے ڈال دئے ہیں۔ صحیح تاریخی مصادر کی عدمِ دستیابی کو بہانہ بنا کر بارد تاویلات پیش کی گئیں۔ اِس میں شبہ نہیں کہ کشمیر میں کافی مدت کے بعد مسلمانوں کی طرف سیاسی اقتدار منتقل ہوا مگر سادہ لوح مؤرخوں نے مسلمانوں کے برسرِاقتدار آنے کو ان کے نفسِ وجود پر قیاس کیا جو حقیقت سے بالکل بعید ہے۔

دینی علوم اور عربی و اسلامی فنون کی ترویج و اشاعت کا کام باقاعدہ طور پر اُس وقت سے ہی شروع ہوا جب حضرت امیرِ کبیر میر سید علی ہمدانی رحمتہ اللہ علیہ اور اُن کے رفقاءِ کرام نے یہاں ان کی اشاعت کا ایک وسیع نظام قائم کیا۔ مگر اِس سے یہ مراد لینا کہ کشمیر حضرت امیرؒ سے قبل اسلام اور اِسلام کے ثقافتی مراکز سے ناآشنا تھا ایک ناقابلِ قبول دعوی ہے حضرت امیرؒ سے بہت پہلے یہاں مسجدوں اور خانقاہوں کی تعمیر عمل میں آئی تھی جو زمانے کے اُتار و چڑھاو کے ساتھ ساتھ کبھی نمایاں اور کبھی غائب ہو جاتی تھی۔ مسجدیں، جو اُس زمانے میں ذکر و اذکار سے زیادہ درس و تدریس کا کام دیتی تھیں حضرت امیرِ کبیرؒ سے صدہا سال پہلے سے کشمیر کے اطراف و جوانب میں وجود میں آئی تھیں۔ مؤرخ ابو سعید گردیزی، سلطان محمود غزنوی کے

حالات میں لکھتے ہیں کہ:

امیر محمود فرمان داد تا آں قلعہا کہ اندراں درۂ کشمیر بود گرفتند و غارت کردند .. ..
اندریں سال فرمودند ہر جائیکہ کشادہ بود از دیارِ کفار مسجد ہائے جامع ساختند۔[1]

سلطان محمود نے حکم دیا کہ درۂ کشمیر کے وہ تمام قلعے برباد کر دیئے جائیں جو قبضے میں لائے گئے ہیں ....
... ... اسی سال سلطان نے یہ حکم بھی صادر کیا جو جگہ غیر مسلموں سے خالی ہو جائے وہاں مسجدیں تعمیر کی جائیں۔

بلکہ اس سے بھی تین سو سال قبل یعنی پہلی صدی ہجری کے آخری دہے میں کشمیر کے مضافات میں مسجدوں اور مندروں کی تعمیر کا سراغ ملتا ہے۔ چچ نامہ میں اِس کی تفصیل یوں ملتی ہے کہ جب محمد بن قاسم نے دیبل (موجودہ کراچی) کے حکمران داہر کو شکست دی تو وہ ۱۰ رمضان ۹۳ھ کو میدانِ جنگ میں کام آیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے جیسیا نے کچھ دیر کے لئے مقاومت کی مگر اُس نے بھی شکست کھائی۔ داہر اور جیسیا کی فوج میں عرب سپاہی بھی تھے۔ جیسیا جان بچانے کی غرض سے بھاگ گیا اور کشمیر کے راجہ کے ہاں پناہ لی اس وقت اس کے ساتھ اس کا ایک وفادار شامی رفیق جہم بھی تھا۔ حاکمِ کشمیر نے جیسیا کے ساتھ ساتھ اس کے مسلمان رفیق کی بھی دل و جان سے پذیرائی کی۔ جہم نے کشمیر ہی میں مستقل قیام کیا تھا اور اس کی اولاد یہاں آباد ہوئی جنہوں نے یہاں مسجدیں بھی تعمیر کیں۔

نسلِ او تا ایں غایت برقرار است و مساجد بنا کرد ....

جہم کی نسل آج تک یہاں موجود ہے اور مسجدیں بنائی ہیں ....

---

[1] زین الاخبار: ابو سعید عبدالحی گردیزی ترتیب: عبدالحی حبیبی، ایران ص ۱۸۱

و ملکِ کشمیر اور امحترم داشتی [۱] حاکمِ کشمیر ان کی عزت کرتا ہے۔

خاص اِسلام کی اِشاعت اور اِسلامی اداروں کے بارے میں مُصنّف نے لکھا ہے:-

"ہندوستان محمد بن قاسم اور عرب و شام کے امرائ کے ہاتھوں فتح ہوا۔ اُسی زمانے میں اِسلام یہاں پھیل گیا اور دریائے محیط سے لیکر قنوج اور کشمیر کے حدود تک مسجدوں اور منبروں کی تعمیر عمل میں آئی۔" [۲]

غرض کشمیر اور اِس کے اطراف و حوالی میں اِسلامی اور دینی مراکز کی موجودگی کا سُراغ پہلی صدی ہجری ہی سے شروع ہوا تھا اور حضرت شاہ ہمدانؒ کے ورودِ مسعود کے زمانے تک یہ سلسلہ عروج اور زوال کے مختلف مراحل سے گزر کر ایک خاص منزل پر پہنچ چکا تھا۔ حضرت امیرؒ کی سیاحتِ کشمیر سے پچاس برس پہلے کشمیر کے اطراف و جوانب میں سلسلۂ چشتیہ سے وابستہ بزرگ خانقاہی نظام کی داغ بیل ڈال چکے تھے [۳]۔ خود حضرتِ سلطان الاولیا شیخ نظام الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک کشمیری شال تھا۔ حضرت امیر کبیرؒ (متوفی ۷۸۶ھ) کی سیاحتِ کشمیر سے تیس برس قبل سلطان محمد بن تغلق نے ہندوستان کے ایک جلیل القدر عالم شیخ شمس الدین یحییٰ (وفات ۷۴۷ھ) کو

---

[۱] چچ نامہ: تصحیح و تعلیق: عمر بن محمد داؤد پوتہ، حیدر آباد ۱۹۳۹ء: ص ۹

[۲] چچ نامہ: ص ۹

[۳] سیر الاولیاء دہلی ۱۳۰۲ھ: ص ۱۹۳

فوری طور پر کشمیر جانے کا حکم دیا تھا۔ جو شیخ کے اچانک انتقال کرنے کی بنا پر تشنۂ تکمیل رہا۔ اگر مسئلہ صرف لوگوں کو مسلمان بنانے کا ہوتا تو سلطان کے سامنے شیخ شمس الدین یحییٰ رح سے زیادہ موزون مبلّغ حضرات موجود تھے شیخ مبلّغ اور مرشد سے زیادہ متبحّر عالم اور اُستاد کی حیثیت سے مشہور تھے اور کشمیر میں اُس زمانے میں اشاعت علم اور تدریسِ علم کی ضرورت تھی۔ قدرت نے اِس کام کے لیئے حضرت امیر کبیر رح کو منتخب کیا جنہوں نے اپنے اخلاص، تقویٰ، ربانی بصیرت، علمی تبحّر کے بدولت ہر محاذ پر وہ کامیابی اور سرفرازی حاصل کی جس کے آگے سلاطین اور صوفیاء کی ساری کاوشیں اُن کے خلوص و خلش کے باوجود ماند پڑ گئیں۔

جب کشمیر میں مسلمانوں کی طرف اقتدار منتقل ہوا تو سلاطینِ کشمیر نے اِسے ایک صحیح اور صالح اِسلامی ریاست بنانے میں پوری دلچسپی لی۔ سلطان شہاب الدین نے اِس مقصد کو عملی جامہ پہنانے میں پہل کی اور سلطان زین العابدین نے اِسے اپنے طویل دورِ حکومت میں عروج و کمال پر پہنچایا۔ اِن سلاطین کو اپنے مذہب و ثقافت کے ساتھ عشق تھا۔ علم و ثقافت کی آبیاری کے لیئے اُنہوں نے ہندوستان کے صالح اور دیندار حکمرانوں کی تقلید کی۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلطان قطب الدین، سلطان سکندر اور سلطان زین العابدین کے زمانے میں کشمیر کا ایشیائی کے مشہور علمی اور ثقافتی مراکز میں شمار ہوتا تھا۔ عراق، شام اور خراسان کے ہزاروں بزرگانِ دین، اصحابِ علم و قلم اور اربابِ صنعت و حرفت اِس منہلِ صافی کی طرف متوجہ ہوئے، جنہوں نے اسے مختصر مدت میں بقول فرشتہ عراق اور خراسان کا متبنیٰ بنا دیا۔ سلاطین نے

اِن سارے مہاجرین کی عزّت افزائی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ اِن کے لئے مسجدیں، خانقاہیں اور حمام تعمیر کئے اور فکرِ معاش سے بے فکر رکھنے کے لیے بڑی بڑی جاگیریں بخشیں۔ خود اہلِ کشمیر نے ان کو سر آنکھوں پر جگہ دی تھی۔ ان کے جیتے جی عزّت و احترام دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور ان کے اِنتقال پر ان کی یاد میں مسجدیں، زیارت گاہیں، دینی مراکز، فلاحی ادارے اور خانقاہیں تعمیر کیں۔ سلاطین کشمیر نے اگرچہ سرکاری سطح پر علمی اور ثقافتی ادارے زیادہ تعداد میں قائم نہیں کئے مگر ہر ایک عالم کا مسکن ایک مُستقل مدرسہ بن گیا جس نے عرصہ دراز تک اپنے ماحول کو منوّر رکھا اور آج بھی معاشرے کی اصلاح و تعمیر میں اپنا کردار ادا کر رہے ہے۔

وہ خاص دشواریاں جو کشمیر میں عربی زبان کی اشاعت کی راہ میں حائل ہوئیں

قدیم مبلغین اسلام کی دلسوزی اور ابتدائی شاہمیری سلاطین کی عالی ظرفی و علم دوستی کے باوجود کشمیر میں عربی علوم و فنون کو وہ ترقی اور مقبولیت حاصل نہ ہوسکی جس کی توقع تھی۔ حضرت میر سید علی ہمدانی رح کی کشمیر تشریف آوری سے لیکر آج تک تقریباً سات سو سال کی مدت گزر گئی اور اتنی ہی مدت مسلمانوں نے ہسپانیہ (اندلس یا موجودہ سپین) میں گزاری تھی مگر ہسپانیہ نے اس مدت کے دوران علم وادب کے ہر شعبے میں ایسی جلیل القدر شخصیتیں پیدا کیں جو اپنی نظیر صرف آپ تھیں جبکہ اس کے برعکس کشمیر چند برگزیدہ علمی شخصیتوں کو جنم دینے کے سوا کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام نہ دے سکا۔ ہمارے نزدیک اس کے متعدد اسباب و وجوہ ہوسکتے ہیں جن میں سے کچھ ہم یہاں اپنے محدود مطالعہ کی روشنی میں پیش کرسکتے ہیں۔

اوّل: کشمیر میں اسلام اس وقت داخل ہوا جب پورے عالم اسلام میں مشرق سے لے کر مغرب تک مسلمان زوال اور پستی میں مبتلا ہوچکے تھے۔ مشرقی ممالک پر تاتاری یلغار قہر الٰہی کی صورت میں نازل ہوچکی تھی اور مغرب میں مسلمان سپین کی آخری پناہ گاہ غرناطہ سے بھی نکال دئیے گئے تھے۔ ایک طرف چنگیز خان اور اس کے بیٹے نے مسلمانوں کے صدیوں پرانے تمدنی مراکز کو خاک و خون اور آگ اور راکھ میں تبدیل کرڈالا تھا تو دوسری طرف یورپ کے نامور

پادری صاحبان حکمرانوں کے بھرپور تعاون سے مسلمانوں کے علمی اداروں اور اِن کے تحریری سرمائے کو چُن چُن کر کھُلے میدانوں میں شعلوں کی نذر کرنے میں حظ اُٹھاتے تھے اور اِس کے وارثوں کو تعذیبی مراکز INQUISITION CENTERS میں جھونک کر مذہبی جنون کا رقص دِکھانے میں محو تھے۔

افغانستان، ایران، سمرقند، بخارا، ماوراء النہر، عراق اور شام کے ہزاروں سرسبز و شاداب شہر مٹی میں مِل چکے تھے۔ حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ کے ورودِ کشمیر سے صرف ساٹھ سال پہلے کشمیر بھی منگول فوجی دستوں کی زد میں آیا تھا جو اگرچہ اِس شدید ضرب کے مقابلے میں معمولی خراش کی وقعت بھی نہ رکھتا تھا جس نے سارے وسط ایشیا اور مشرقِ وُسطیٰ کے ایک بڑے حصّے میں مسلمانوں کے تقریباً پورے وجود اور ورثے کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا، مگر کشمیر پر اِس خراش کا ایسا اثر ہوا تھا کہ یہاں کی پوری آبادی پہاڑوں اور جنگلوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئی تھی اور خود کشمیر کا راجہ سہہ دیو کشتواڑ کی طرف بھاگ گیا تھا۔ مؤرخ محمد اعظم دِیدہ مری کشمیر پر منگول حملے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"آہ و فغانِ ساکنان از ہفت آسمان در گزشتہ تا آنکہ نام و نشانِ نوعِ بنی آدم ازیں شہر برداشتہ و بیخ و بُنِ نباتات و اشجار ہم نگزاشتند۔ شہر یکہ از قرون آباد و معمور بود بیا بانے غیر آباد از امن و اماں دور گردید۔"[1]

اِن حالات میں جبکہ کشمیر کے آس پاس کے تمام تمدّنی مراکز اور ثقافتی ادارے

---

[1] تاریخِ اعظمی: ص ۲۷

تباہ اور ویران ہو گئے تھے۔ اور بچے کھچے نشانات کو اسی خاندان کا دوسرا فرد[1] بلٹ پلٹ کر فنا کرنے میں محو تھا، کشمیر کے بارے میں ہم کیا توقع رکھ سکتے ہیں، جو اگرچہ اس وقت ایک نوزائیدہ اسلامی مملکت کی شکل ہی میں وجود میں آیا تھا مگر یہاں اگرچہ مسلمانوں کی تعداد کم بھی نہیں تھی مگر فکری اور تمدنی اعتبار سے کشمیر کوئی مقام نہیں رکھتا تھا۔

دوم: اسلام آنے کے وقت کشمیر ہندی فکر و ثقافت کا حامل تھا، چودھویں صدی عیسوی میں اگرچہ یہاں خود سنسکرت علوم و فنون تنزل کے دور سے گزر رہے تھے، مگر پھر بھی کشمیر ایک مکمل ہندو ریاست ہی تھی اور پرانے ورثے کے جڑ ابھی مضبوط ہی تھے۔ یہاں جگہ جگہ مندر، وہار اور پاٹ شالے تھے اور تقریباً سارے ندی نالے، دریا، جھیل، پہاڑ اور کوہسار دیوی دیوتاؤں سے منسوب تھے۔ تمام اہل کشمیر کو اپنی برہمنیت پر ناز تھا اور وہ علم کی دیوی سرسوتی کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اس کا مسکن کشمیر ہی ہے۔ ذات پات کا خیال یہاں کے باشندوں کے دماغ پر اس قدر مستولی تھا کہ جب کشمیر میں مذہبی انقلاب بڑی تیزی سے آرہا تھا اور تمام لوگوں کے ساتھ اونچی ذات کے لوگ بھی حالات کی تبدیلی کو کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے تھے مگر وہ اب بھی اسے دیوی اور دیوتاؤں کے کرشموں سے تعبیر کرتے تھے اور ملیچھوں کی ناپاکی سے صرف خود اپنا دامن بچاتے تھے بلکہ دوسروں کو بھی بچنے کی تلقین کر رہے تھے۔

---

[1] اس فرد سے ہماری مراد تیمور لنگ سے ہے جو اسلام قبول کرنے کے باوجود تخریب پسندی اور دہشت گردی میں اپنے اسلاف سے مختلف نہ تھا۔

سوم: عربی علوم وفنون کی ترقی کی راہ میں یہاں کی سنسکرت زبان ایک آہنی دیوار کی صورت میں حائل ہوئی۔ اسلامی ممالک سے تعلق رکھنے والے جو علما، یہاں وارد ہوکر مقیم ہوئے انہیں اپنی عبقریت اور ابتکار کے اظہار کے لئے کوئی بازار یہاں موجود نہیں ملا تھا جس سے انہیں قبولِ عام حاصل ہوتا، جو ہر عالم، ادیب اور صاحبِ فن کی آرزو یا فطری کمزوری ہوتی ہے۔ یہاں یقیناً سلطان قطب الدین، سلطان سکندر اور سلطان زین العابدین نے اپنی علم دوستی اور علماء پروری میں نامور علم پرور اور علماء نواز حکمرانوں کی یاد تازہ کی مگر ناسازگار ماحول نے ناقابلِ تسخیر دیواریں حائل کیں۔ قوموں کی تاریخ میں مختلف زبانوں کے تصادم سے ناموں کا مسخ اور تنسیخ ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ مگر کشمیر میں یہ تنسیخ اور تحریف جس طرح ہوتی رہی اس کی مثال بڑی مشکل سے مل سکتی ہے۔ قدیم صوفیائے کرام، جو میر سید علی ہمدانیؒ سے بہت قبل کشمیر میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کرتے تھے، ان کے صحیح ناموں کا تعین کشمیری زبان و ادب کے طلباء کے لیے آج بھی ایک مستقل معمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

چہارم: علوم وفنون کی ترقی اور گرم بازاری کے لئے کسی مقام کی مرکزیت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ جہاں مختلف مذاہب کا گزر بسر، متنوع ثقافتوں کا میل جول، اربابِ سیاست کی گن گرج، اربابِ فنون کی نمائش اور صنعت و حرفت کی گہما گہمی ہو۔ کشمیر جغرافیائی اعتبار سے ہمیشہ اپنے اطراف و جوانب سے الگ تھلگ مقام اور محل پر واقع ہے، وسیع اور بہت مہیب جنگلوں، فلک بوس پہاڑوں میں محصور و محبوس ہونے اور طویل ترین سرمائی موسم کا شکار رہنے کی وجہ سے یہاں علوم وفنون کو کبھی وہ پھیلاؤ نصیب نہ ہوسکا جس کے لئے

مختلف ثقافتوں کا ٹکراؤ اور گرم بازاری ناگزیر ہوتی ہے۔ ہندو دورِ حکومت میں بھی یہاں اُن ہی علوم و فنون کو زیادہ عروج ملا تھا جن کا تعلق گیان اور دھیان سے ہوتا تھا۔ اِس دور میں یہاں جو فنون اوجِ ترقی پر پہنچے تھے، ان میں ایک فحش نویسی کا فن بھی تھا۔ ایک اور فن، جو ترقی پا کر ہندوستان کی بڑی بڑی شخصیتوں کے لیے بھی توجہ کا مرکز بن گیا تھا، کشمیر شیوازم تھا۔ مگر یہ فن بھی زیادہ تر دماغی ورزش اور عقلی پہلوانی کا مرہونِ منّت ہے۔

سلطان سکندر اور اِس کے بیٹے سلطان زین العابدین نے ہر چند کشمیر کو اسلامی دُنیا کا ایک علمی مرکز بنانے کی سعی کی مگر وہ اپنی اِس کوشش میں سو فیصد کامیاب نہ ہوسکے جس کی ایک بڑی وجہ کشمیر کی ذاتی مشکلات بھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ خود کشمیر کے علمائے مجدّدینِ اِسلام کا شیخ و مُرشد بننا ضرور مقدر میں لکھا تھا البتہ خود کسی مجدّد کو پیدا نہ کرسکے۔

دینی اعتبار سے عربی تعلیم و تدریس کی ضرورت

مذکور الصدر مشکلات و موانع حائل ہونے کے باوجود کشمیر میں عربی زبان، مروج ہوگئی یہاں کے مسلمان کھلے دل و دماغ اور نہایت عقیدت و محبت کے ساتھ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ اِس لیے ان کیلئے عربی زبان سے بقدرِ ضرورت واقف ہونا لازمی تھا۔ جس کا کھلا ثبوت یہ ہے کہ یہاں جگہ جگہ مسجدوں، خانقاہوں اور مدارس کی تعمیر ہوئی۔ اِسلام قبول کرنے کے لئے ایک مسلمان کو کلمۂ طیبہ پڑھنے اور اپنا نام بدل دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اِس طرح وہ سب سے پہلے عربی زبان سے متعارف ہوتا ہے۔ آگے یہی زبان عبادات کی ادائگی کے لئے سیکھنی پڑتی ہے، کیونکہ اِسلامی عبادات و معاملات کا سرچشمہ قرآن اور حدیث کی

کتابیں ہیں جو عربی میں ہیں۔ اِن میں پانچ وقت کی نماز، جمعہ، عیدین، نکاح و طلاق وغیرہ کے شروط و قواعد سب عربی میں ہوتے ہیں۔ آگے اگر کسی کو اوراد و وظائف، اذکار و ادعیہ، حج و تبلیغ وغیرہ کی سعادت نصیب ہو سکے تو اس کے لیے بھی عربی الفاظ اور اصطلاحات سے واقف ہونا ضروری ہے۔ چونکہ کشمیر میں حکمرانوں کے بجائے صوفیائے کرام کی کوششوں سے اِسلام شائع ہوا تھا۔ اِس لیے یہاں کے نومُسلموں میں عربی کی دینی تعلیم کا شوق زیادہ پایا جاتا تھا۔ آگے قرآنِ پاک کی تلاوت، جو عربی تعلیم کے لئے سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے ہر اِمام اور موذِن کے لئے لازمی تھی اِس طرح یہاں کی آبادی کا ایک بڑا حِصّہ عربی زبان اور قرآنی تعلیمات سے واقف ہوا۔ تلاوت کے لئے قرأت اور تجوید سے بھی واقفیت ضروری ہوتی ہے۔ غرض عربی زبان اور مسلمان لازم و ملزوم ہیں ظاہر ہے کہ جب کشمیر میں اِسلام رائج ہوا تو عربی تعلیم و تدریس کا اِنتظام کرنا وقت کے اِنتظامیہ کے لیے ناگزیر تھا۔ چنانچہ ہمیں کشمیر کی تاریخ کے ہر دور میں بڑی بڑی علمی دانشگاہوں کے علاوہ مُستقل قرآنی درسگاہیں بھی ملتی ہیں، جِن کا سلسلہ حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ کے زمانے سے لے کر آج تک برابر جاری نظر آتا ہے۔

میر سید علی ہمدانیؒ اور میر سید محمد ہمدانیؒ کے عرب رفقاء

جب مسلمانوں نے کشمیر میں اقتدار سنبھالا تو بیرونی اِسلامی ممالک سے ہزاروں علماءؒ اور مبلّغین یہاں وارد ہو کر مقیم ہوئے، اگرچہ اِن میں سے بیشتر کا تعلق وسطِ ایشیا کے اُجڑے ہوئے ممالک سے تھا تاہم کئی سرکردہ علمی اور روحانی شخصیتوں کا تعلق عرب ممالک سے بھی تھا۔ یہ سب

میر سید علی ہمدانیؒ اور ان کے فرزند میر سید محمد ہمدانیؒ کے اصحاب واحباب میں سے تھے۔ اِن میں دو بزرگ سیّد محمد قریشیؒ اور سید احمد قریشیؒ تھے۔ اوّل الذکر نے بجبہاڑہ میں قیام کیا تھا اور ان ہی کے زمانے میں یہاں کا تاریخی مندر تاریخی جامع مسجد میں تبدیل ہوا۔ اِن کے برادر سید احمد قریشی لیتہ میں اقامت گزین ہوئے تھے اور وہیں محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ میر سید علی ہمدانیؒ کے رفقاء میں میر سیّد محمد مدنیؒ براہِ راست مدینہ طیبّہ سے تعلق رکھتے تھے۔ نوشہرہ سرینگر کے متصل اُن کا مقبرہ مشہور ہے۔ سیّد حسین صاحب بلاذَر سے تعلق رکھتے تھے جو باب الابواب کے متصل تھا۔ مشہور مؤرخ ابوالحسن بَلاذُری صاحبِ فتوح البُلدان کا تعلق اسی جگہ سے تھا۔ ہمارے مؤرخوں میں سے کسی نے بلاذُری اور کسی نے بلادِروی لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ مفتی محمد شاہ سعادت مرحوم نے تاریخ اعظمی کی اشاعت کے وقت اِس کی تصحیح کی ہے[1]۔ چکوں کے دورِ حکومت بھی ایسی علمی شخصیات کا کشمیر وارد ہونے کا سلسلہ جاری نظر آتا ہے۔ مثلاً ایک بزرگ شیخ اسماعیل تھے[2] جو شام کے رہنے والے تھے۔ دو مرتبہ حج کیا تھا اور سلسلۂ قادریہ کے شیخِ وقت اور عابدِ شب زندہ دار تھے۔ کشمیر میں حضرت علامہ داؤد خاکی (م ۹۸۰ھ) کے ہاں قیام کیا۔ آپ کی خوش آمدید میں حضرت خاکیؒ نے ایک قصیدہ بھی نظم کیا تھا، جس کے دو شعر یہ ہیں:۔

خدا راگفتہ حمدِ بے تناہی	پس از نعتِ رسالت دستگاہی
کہ آمد سید اسماعیل شامی	بکشمیر از عنایاتِ الٰہی

---

[1] تاریخ اعظمی: ص ۵۳ (حاشیہ)

[2] کشمیر کی تاریخوں اور تراجم کی کتابوں میں ہمیں شیخ اسماعیل نام کی کئی شخصیتوں کا

تقریباً اسی زمانے میں میر شمس الدینؒ نے بھی عراق سے وارد ہو کر یہاں امامیہ تحریک کی بنیاد ڈال دی۔ اگرچہ اس تحریک سے کشمیر کو ایرانی فکر و ثقافت اور فارسی زبان و ادب کے ساتھ تعلقات مستحکم کرنے میں بڑی مدد ملی تاہم میر شمس الدینؒ نے اپنے عقائد اور فلسفہ کی شرح و وضاحت کے لئے عربی زبان ہی کو وسیلہ بنایا۔ اُنھوں نے عربی میں **اَحوَط** کے نام سے ایک ضخیم کتاب تالیف کی جس کی شہرت میر شمس الدینؒ کے اِنتقال کے بعد کشمیر سے گزر کر ہمایوں بادشاہ کے دربار سے ٹکرائی تھی۔[۱]

عرب ممالک کے ساتھ شاہمیری سلاطین کے تعلقات

شاہمیری سلاطین کشمیر کو صحیح اسلامی ریاست بنانے کے آرزومند تھے۔ خاص طور پر سلطان قطب الدین (مرید میر سیّد علی ہمدانیؒ) سلطان سکندر (مرید میر سیّد محمد ہمدانیؒ) اور سلطان زین العابدین (مُرید شیخ نورالدین ریشیؒ) نے پورے اخلاص کے ساتھ کشمیر کو اِسلام کے قالب میں ڈھالنے کی کوششیں کیں۔ اِن میں

(بقیہ حاشیہ صہ سے آگے) تذکرہ ملتا ہے، جن میں شیخ اسماعیل کبروی اور شیخ اسماعیل شامی خاص طور سے اہم ہیں۔ بعض کتابوں میں شیخ اسماعیل کبروی کے حالات میں کبروی کے بجائے شامی چھپا ہے (مثلاً دستور السالکین مطبوعہ لاہور صہ ۱۰۳) جو صحیح نہیں ہے۔ حضرت شیخ اسماعیل کبروی کشمیری الاصل بزرگ تھے جن کی ہمہ گیر اصلاحی اور تجدیدی خدمات کا تعارف خاکسار مؤلف نے اپنی دو مطبوعہ کتابوں میں تفصیل سے پیش کیا ہے اور اس کتاب میں بھی آگے کچھ مزید معلومات درج کئے جائیں گے۔ ملاحظہ ہو احقر کی درج ذیل دو کتابیں:۔ ۱۔ کشمیر میں اسلام کی اشاعت: ص ۱۷۰ تا ۱۷۲، نیو کشمیر پریس سری نگر سنہ ۱۹۸۳ء

۲۔ کشمیر میں اسلامی ثقافت کی اشاعت ص ۹۹ تا ۱۰۵، " " " سنہ ۱۹۸۷ء

[۱] تاریخ رشیدی (انگریزی ترجمہ) اکیڈمیکا آیشیاٹیکا انڈیا سنہ ۱۹۷۳ء ص ۴۳۲، ۴۳۵۔

عرب ممالک کے ساتھ کشمیر کے روابط استوار کرنا بھی شامل تھا۔ اگرچہ ہلاکو خان کے ہاتھوں بغداد کی تاراجی اور آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کے قتل کے بعد اسلامی خلافت کا عملاً خاتمہ ہوگیا تھا مگر خلافت کو کم از کم نام کے لئے زندہ رکھنے کی غرض سے مصر میں جو کوششیں ہوئیں ان کی آبرو سلاطینِ کشمیر نے بھی رکھی۔ مصر کے ساتھ سلطان زین العابدین کا سفارتی تعلق قائم کرنا بھی تاریخوں سے ثابت ہے[1]۔ اسکے علاوہ اس دور کے کچھ کشمیری سکوں پر نائب خلیفۃ الرحمان کی عبارت کندہ کی ہوئی ملتی ہے[2] جس سے خلفأ اور خلافتِ اسلامیہ کے تئیں سلاطینِ کشمیر کے احترام کا سراغ ملتا ہے۔ کچھ سکوں پر أمیر المومنین اور نصیر الدین کندہ ہے[3]۔ زین العابدین کے درباری ہندو مؤرخ جونراج نے لکھا ہے کہ بادشاہ نے ایک ایسا منصب دار مقرر کیا تھا جس کی اجازت کے بغیر بادشاہ کا فرزند بھی اس سے نہ مل سکتا تھا۔ یہ وہی منصب ہے جسے خلفائے اسلام نے قائم کیا تھا اور اس منصب پر فائز شخص حاجب کہلاتا تھا[4]۔ سلطان نے صرف قدیم خلفأ کی تقلید و احترام میں ایسا کیا تھا۔ اسی طرح زین العابدین نے حجاز سے اہم مذہبی کتابوں کی نقل بڑے اہتمام سے منگوائی جس کا کشمیر میں مدتِ دراز تک[5]

۱؎ کشمیر سلاطین کے عہد میں: پروفیسر محب الحسن، ترجمہ: علی حماد عباسی، دار المصنفین اعظم گڑھ: ص ۳۰۸۔

۲؎ و ۳؎ THE SQUARE SILVER COINS OF SULTANS OF KASHMIR, C. J. RODGERS J.R.A.S.B, 1885.

۴؎ اس کے لئے علامہ ماوردی کی کتاب الاحکام السلطانیہ دیکھی جا سکتی ہے۔

۵؎ تاریخ بہارستان شاہی (قلمی) اور تاریخ حسن جلد ۲

بڑا چیر جارہا۔ یہ تب ہی ممکن ہوسکتا تھا جب کشمیر کے حکمرانوں نے حجاز والوں کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کئے تھے۔ اسی دور میں کشمیر کے مسلمانوں نے حج اور زیارت کا سلسلہ بھی بڑے پیمانے پر شروع کیا۔ ان میں جو اہلِ علم ہوتے تھے وہ حجاز کے علماء سے براہ راست علمی اور روحانی فیوض حاصل کرتے تھے۔

حضرت امیرؒ اور ان کے لائق فرزند کے ساتھ شاہ ہمدان کے وہ رفقاء جو مختلف مراحل پر جو مبلّغین کشمیر میں وارد قرأت و تجوید کے ماہر تھے ہوئے ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی فن میں مہارت رکھتا تھا اور کشمیر اس وقت ہر فنکار کا محتاج تھا۔ اگر ایک طرف ان میں شیخ جمال الدین محدّث جیسے عالمِ دین تھے تو دوسری طرف خواجہ صدر الدین خراسانی جیسے فنِ تعمیر کے ماہر بھی جو خاص مسجدوں اور خانقاہوں کی تعمیر کے لئے کشمیر تشریف لائے تھے یا بُلائے گئے تھے حضرت امیر کبیرؒ نے کشمیر میں منجملہ دوسرے فنون کے جس خاص علمی شعبہ کی ترویج و اشاعت کی طرف خصوصی توجہ دے دی وہ قرآنِ حکیم کی قرأت اور تجوید کا فن بھی تھا، اس مقصد کے لئے اُنہوں نے چند ممتاز ترین قُرّاء کو بھی اپنے ساتھ لایا تھا جن میں امام القرّاء ملّا سلیمان ایک تھے۔ سلطان قطب الدین نے قرآن کی تعلیم عام کرنے کی غرض سے جب مدرسۂ قرآن کے نام سے ایک مستقل ادارہ قائم کیا تو ملّا سلیمان ہی کو اس کا سربراہ بنایا۔[1] خاص سلطان کی تعلیم کے لئے ایک خراسانی عالم کو مقرر کیا گیا جو ہفت قرأت کے ماہر تھے[2]۔ سلطان سکندر کے لئے بھی میر سیّد محمد ہمدانیؒ نے دربار میں ایک قاری کو مستقل طور پر موجود رکھا تھا[3]۔

---

[1] تاریخ کشمیر (انگریزی): محی الدین صوفی، حصۂ دوّم

[2] تاریخ اعظمی صفحہ ۴۸ [3] ایضاً: ص ۶۴

شاہمیری دورِ حکومت کے اختتام پر ایک مشہور قاری حاجی احمد خلف الصدق مخدوم عباس مُلتانی لاہور سے کشمیر تشریف لائے۔ حضرت مخدوم شیخ حمزہ رحمتہ اللہ علیہ نے اِنھیں کشمیر ہی میں مستقل قیام کرنے کی صلاح دی تھی تاکہ یہاں کے مسلمان قرأت اور تجوید میں اِن سے فیضیاب ہو سکیں۔ ان کی فیض رسانی کے بارے میں مفتی سعادت رح لکھتے ہیں:-

"حضرت سلطان (شیخ حمزہ مخدوم کشمیریؒ) نے انھیں واپس جانے کی اجازت نہیں دی۔ بلکہ یہاں کی رہائش کا ارشاد فرماتے ہوئے قرآنِ مجید کے درس و تدریس اور قرأت و تجوید کے بہترین فن کی عام نشر و اشاعت کی تاکید کی۔ یہ تحریک عام فیضان پہنچانے کا بڑا ذریعہ تصور کی جاتی ہے۔ جس کی نوعیت کو مدِ نظر رکھ کر تجوید قرأت اور قرآن خوانی کے علمی فن نے ایک خاص حد تک فروغ پایا۔ شہر و دیہات کے لوگ آتے اور فیضیاب ہوتے تھے[۱]"

حاجی احمد قاری نے ۸ رماہ رمضان ۹۶۹ میں انتقال کیا اور اپنی خانقاہ کے سامنے، جس کا اب کوئی نام و نشان بھی باقی نہیں ہے، دفن کئے گئے۔ علمائے نے اِنتقال کے وقت توُفِّیَ اَعْلَمُ القرآن کہا اور اِسی سے اِن کے انتقال کی تاریخ بھی اخذ ہوتی ہے۔ اِس طرح قرآنِ پاک کی عام تعلیم سے عربی زبان کی اشاعت اور اِس سے عشق و محبت گہرا ہونے کے لئے راستہ ہموار ہوا۔ اعظمی نے

---

۱ سوانح حضرت بابا داؤد خاکی رح : ص ۴۳

۲ تاریخِ اعظمی : ص ۲۶۷

عجائباتِ کشمیر میں سے ایک عجوبہ یہ بھی لکھا ہے کہ کشمیر اور شرع ابجدی اعداد کے لحاظ سے برابر ہیں۔ اگرچہ اسے کوئی علمی اہمیّت حاصل نہیں ہے مگر اتنا تو بہرحال صحیح ہے کہ یہاں کے لوگوں نے دِل سے اِسلام قبول کیا تھا۔ قرآن سے ان کی محبت ہمیشہ سے خون کے ساتھ ساتھ دورہ کرتی رہی ہے جسے زمانے کی کوئی بھی سرد لہر مُنجمد نہ کرسکی۔

عربی تعلیم کی طرف راغب کرنے میں حضرت شیخ نورالدین ریشیؒ کا حصّہ

عربی زبان اور اسلامی تعلیمات کی طرف عوام کو راغب کرنے میں اوّلین مبلّغین اسلام نے جو کردار ادا کیا ہے وہ ایک مسلّمہ تاریخی حقیقت ہے مگر بہرحال یہ حضرات اجنبی تھے اور کشمیر کی عام بول چال کی زبان سے ناواقف تھے۔ قرآن اور قرآنی تعلیمات کا شوق دلانے اور ایک مسلمان کے دِل میں ان کی اہمیّت اُجاگر کرنے کے لئے مقامی شخصیتوں کا میدان میں آنا ضروری تھا۔ قدرت نے اس مقصد کے لئے دو بزرگ شخصیتوں کو منتخب کیا۔ ہماری مُراد شیخ احمد خوشخوانؒ اور حضرت شیخ نورالدینؒ سے ہے۔ حضرتِ شیخ احمدؒ[1] خود بلند مرتبہ قاری قرآن تھے اور قرآنِ پاک کو خوش الحانی سے تلاوت کرنے میں بڑے نامور ہوئے تھے۔ انکی وجہ سے

[1] شرکت ایک کشمیری ہندو تھے، شاہ ہمدانؒ کے ورودِ کشمیر سے پہلے ہی اسلام قبول کر چکے تھے اور قرآنِ پاک حفظ کیا تھا۔ مگر یہاں کی ہندو برادری سے خائف ہو کر سمرقند کی طرف ہجرت کی۔ ایک دن کولاب میں ان کی ملاقات حضرت شاہ ہمدانؒ سے ہوئی۔ اُنہوں نے ان کا اِسلامی نام شیخ سلیمان رکھا۔ اس وقت ان کے ساتھ ان کے فرزند شیخ احمد بھی تھے جو قرآنِ مجید نہایت پُراثر لب و لہجے میں تلاوت کرتے تھے اور اس میں اتنے مشہور اور محترم ہوئے کہ "خوشخوان" ان کے نام کا ایک جزو ہی بن گیا۔ شیخ احمد خوشخوان کی اولاد میں انکے فرزند حافظ فتح اللہ صاحب علم اور تصوف میں مشہور ہوئے۔ تصوف کی چاشنی رکھنے کے

سینکڑوں نومسلم کشمیریوں کے دل قرآن پاک کی محبت سے سرشار ہوئے اور آگے ان کی اولاد نے سو سال سے بھی زیادہ مدت تک قرآنی تعلیمات کی آبیاری کی۔

حضرت شیخ نورالدین ریشی کشمیریؒ اپنے زمانے میں کشمیر کے رشیوں کے لئے مرکز و محور کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ اگرچہ حضرت امیرؒ کے ہمعصر تھے مگر اُن سے حضرت شیخؒ کی ملاقات کی تصدیق کسی معتبر ماخذ سے نہیں ہوتی ہے۔ جب حضرت امیرؒ کے انتقال کے

باوجود توحید کے علمبردار اور کفر و شرک کے کھلے مخالف تھے، ان کا ایک ارشاد اعظمی نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے :-

" مردم نے گویند کہ فلاں از خدا دور شدہ است ، این کفرِ محض است ، چیزے از خدا دور نیست ۔" ص ۶۶

حافظ فتح اللہ صاحبؒ کے فرزندوں میں مُلّا اسماعیل کُبروی اپنے وقت کے جلیل القدر عالِم، عابد اور مُصلح تھے۔ اُنہوں نے ایک پُرآشوب دَور میں کشمیر میں احیائے سُنّیت کا فریضہ انجام دیا۔ اُنہوں نے اپنے والدِ بزرگوار (حافظ فتح اللہ صاحبؒ) کے نام پر اپنے لائق اور عالم فرزند کا نام بھی بابا فتح اللہ رکھا۔ بابا فتح اللہ صاحبؒ سے جن سرکردہ بزرگوں نے علمی اور باطنی فیوض حاصل کئے تھے اُن میں حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ جیسے بابرکت بزرگ بھی ایک تھے۔ خلفائے راشدین کی محبت اور عقائدِ اہلِ سنّت کی تجدید کے جذبہ میں اُنہوں نے اپنے چار فرزندوں کے نام خلفائے اربعہ کے اسمائے گرامی پر رکھے۔ حالات کی نامساعدت اور حکومت وقت کی انتقام گیری سے عاجز آ کر اُنہوں نے اپنے افرادِ خانہ سمیت سیالکوٹ (پنجاب) کی طرف ہجرت کی۔ اس وقت سیالکوٹ میں بہت سے کشمیری علمأ، تُجّار اور شرفأ موجود تھے جو پہلے ہی ہجرت کرکے یہ مجبور ہوئے تھے۔ انہی مہاجر علمأ میں مُلّا کمال اور مُلّا جمال بھی شامل تھے جو پورے پنجاب میں اپنی علمی صلاحیت اور

بارہ سال بعد اُن کے فرزند میر سید محمد ہمدانیؒ یہاں وارد ہوئے تو اِن کی آمد پر مسرت کا اِظہار کرنے اور خوش آمدید کہنے والوں میں حضرت شیخ نورالدین ریشیؒ بھی شامِل تھے۔ ان کا اس وقت کا ارشاد "کأشرین پیر آو" یعنی کشمیریوں کے مُرشد آگئے، تاریخ اور سوانحی کتابوں میں ثبت اور ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس ارشاد سے حیرت انگیز طریقے پر میر سید محمد ہمدانیؒ کے داخلۂ کشمیر کی تاریخ بھی نکلتی ہے۔

حضرت شیخ اگرچہ دو پشتوں سے دائرۂ اِسلام میں داخل ہوئے تھے مگر جس سلسلۂ ریشیت کے وہ اپنے زمانے میں داعی اور علمبردار تھے وہ ابھی تک "سمنیت"، "ہندویت" کی آمیزش سے پاک وصاف نہیں تھا۔ اِس کا اعتراف گیارہویں صدی ہجری (۱۷ویں صدی عیسوی) کے نامور کشمیری عالم اور مُصنف شیخ داؤد مشکواتی محدثؒ نے غیر مبہم الفاظ میں کیا ہے۔ مگر جونہی حضرت شیخ نورالدینؒ کی مُلاقات مبلغین اسلام بالخصوص حضرت سید حسین سمنانیؒ اور حضرت میر سید محمد ہمدانیؒ سے ہوئی تو اُنہوں نے ریشیت کو صحیح اِسلامی خطوط پر ڈال دیا، جس سے اسلامی ریشیت (احسان وسلوک) ہندو ریشیت سے ممیز ہو کر علیحدہ شکل وصورت

تدریسی شان میں ناموری حاصل کر چکے تھے۔ بابا فتح اللہ نے یہیں اپنی دو صالح بیٹیوں کا نکاح مُلا کمال اور مُلا جمال سے کیا۔ مُلا کمال کی عظمت و جلالت کے لئے صرف اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ حضرت شیخ احمد سرہندی مجددؒ، مُلا عبدالحکیم سیالکوٹی اور سعداللہ علامی اُن کے اَخص شاگردوں میں سے تھے۔

میں وجود میں آئی۔ اب حضرت شیخ نے کھل کر اپنی سابق طرزِ زندگی کی تغلیط کی جس میں غار نشینی، جنگل پیمائی، مسلسل فاقہ کشی اور زندگی سے فرار ضروری لوازم کی حیثیت رکھتے تھے۔

حضرت شیخؒ نے مصلحینِ کشمیر میں سب سے پہلے عربی زبان کی اہمیت محسوس کر کے اپنے ہموطنوں کو اس کا احساس دلایا۔ ان کے منظوم کشمیری کلام کی ایک اہم رباعی یہ ہے:

ٹھڑی کنٹڑی وَسَن کیکر مؤرہن　　اَدہ گژھ ہے زُورَن تفاوُت
تنتہ تم موکلن یمن عربی فورن　　تنتہ چھا ہارن تہ موہرن تفاوت[1]

(قیامت کے دن اِن ہی لوگوں کی طاقت بھاری ثابت ہوگی جنھیں عربی میں بات کرنا آئے گا۔ جس طرح درہم پر دینار کی فوقیت مسلّم ہے اسی طرح اس شخص کی طاقت بھی یقیناً بھاری ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں کیکر کے درخت کی کانٹے دار چھڑی ہوتی ہے)۔

اُنھوں نے خود بھی عربی دینی تعلیم سیکھنے میں پہل کی، جس کا واضح ثبوت اُن کا وہ منظوم کلام ہے جو کشمیری شعر و ادب کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ کشمیر کے وہ بزرگ جو متقدّم مسلمان ریشی صاحبان کے صحیح اسلامی نام محفوظ نہیں رکھ سکے اُنھوں نے بہت جلد کس طرح قرآنی تعلیمات کا مغز اور عطر کھینچ کر سنسکرت الفاظ سے لبریز علاقائی زبان میں طرزِ بیان کی پوری اثر آفرینی کے ساتھ پیش کیا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس میں یقیناً اُن غیر کشمیری مبلّغینِ اسلام کی ترغیب و تحریص کارفرما رہی ہوگی جن کے ساتھ حضرت شیخؒ نے روحانی اور فکری روابط استوار کئے تھے۔ حضرت میر سید محمد ہمدانیؒ بڑے ذہین عالم اور اپنے

[1] کلام شیخ العالم: شایع کردہ مکتبۂ علم و ادب ۱۹۸۸ء ص ۲۷۰

مشن کے حد درجہ پُرخلوص مبلّغ تھے۔ اُنہوں نے بھی یہاں پہنچ کر ہزاروں نومسلم کشمیری باشندوں کی تعلیم وتربیت کے لئے ان کی مادری زبان کی اہمیت وافادیت محسوس کی ہوگی۔ اِسی طرح جو شخص اُس زمانے میں کشمیری زبان کا بُلبل ہزار داستان تھا، اسی کو اسلامی تعلیمات کے گیت گانے کی طرف راغب کیا ہوگا۔ حضرتِ شیخؒ نے نہایت کامیابی کے ساتھ اِس اہم فریضہ کو پوری عمدگی کے ساتھ انجام دیا اور ہم دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اِن کا منظوم کشمیری کلام کشمیری زبان میں لکھی ہوئی سب سے پہلی دینیات ہے اور اپنی ادبی لطافت کے لحاظ سے آخری بھی ہے۔

حضرت شیخؒ نے عبادات، عقائد اور اخلاقیات کی ترجمانی خالص عربی اصطلاحات ہی میں کی۔ عبادات کے باب میں ہمیں نماز، روزہ، زکواۃ، حج، رکوع، سجود، صحیح قرأت، نیّت، طہارت، غسل وغیرہ کی اہمیت فقہی موشگافیوں میں اُلجھنے کے بغیر نظر آتی ہے۔ عقائد میں کفر، اِسلام، ایمان، کلمۂ طیّبہ، جنّت، دوزخ، شفاعت، کراماً کاتبین، قرآن، عذابِ قبر وغیرہ کی وضاحت مؤثر اسلوب میں ملتی ہے۔ اخلاقیات میں حسد، نفاق، بغض، قیل وقال سے اجتناب۔ اسلامی شعائر میں قبلہ، کعبہ، یا کعبۃ اللہ۔ احسان وسلوک میں ذکرِ حق، اذکار، تسبیح، اِشراق، لامکان وغیرہ کی تاکید اور شخصیات میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) خلیل اللہ (علیہ السلام)، نوحؑ، صدیق اکبرؓ، فاروقِ اعظمؓ، عثمان ذی النورینؓ (اِسی ترتیب کے ساتھ جو اہلِ سنّت والجماعت کا عقیدہ ہے) جبر. بل، رومی، منصور وغیرہم کی عظمت وبزرگی کی طرف ایسے اشارے کئے ہیں جو بڑی معنوی گہرائی کے حامل ہیں۔ یہ علمی مجادلے اور فقہی موشگافیوں سے پاک ہیں اور گزشتہ سات سو سال سے ہر عالم اور عامی اِن سے یکساں طور پر اِستفادہ کرتا آیا ہے۔

حضرتِ شیخؒ نے یہ سارے صفات اور اصطلاحات اپنی مادری زبان میں اس طرح پیش کی ہیں کہ عربی مزاج کہیں متأثر نہیں ہوا ہے۔ عروض کے ماہرین کو حضرتِ شیخؒ کے کلام کی تقطیع کرنے اور بحریں ڈھونڈ نکالنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں حضرتِ شیخؒ نے اپنی رباعیات میں قرآن پاک سے براہِ راست اقتباس کیا ہے۔ بعض رباعیات کا پورا پورا مصرعہ قرآنی آیت سے ماخوذ ہے۔ مثلاً ایک رباعی کا مصرعہ کلّ نفسٍ ذائقۃ الموت ہے[۱]، ایک رباعی میں اینما تولّوا فثمّ وجہُ اللہ سموئی گئی ہے[۲]۔ ایک اور رباعی کا پہلا مصرعہ یہ ہے، "الحمدُ، قل ھو اللہ، التحیّات"[۳]۔ غرض حضرتِ شیخؒ نے اپنی زندگی میں اپنے کلام کے ذریعہ کشمیری میں عربی کی اہمیت اور تقدّس کا احساس دلایا جس سے یہاں کے باشندوں پر اچھا اثر پڑا۔ علماء کی کتابیں اونچی درسگاہوں تک محدود رہیں جبکہ حضرتِ شیخ کے کلام نے عوام الناس کے دلوں کے دریچے کھولے اور انہیں عربی زبان کے ذریعہ دینی تعلیم حاصل کرنے کی طرف راغب کیا۔ میر سیّد محمد ہمدانیؒ کئی کتابوں کے مُصنّف تھے مگر اُن سے چند افراد کو چھوڑ کر کوئی واقف نہیں ہے جبکہ حضرتِ شیخؒ کا کلام پوری غنائیت کے ساتھ برابر سُنا جا رہا ہے۔ جس میں مسجد و مدرسہ سے لیکر کھیت کھلیان سب شامل ہیں۔

فارسی زبان کے ذریعہ عربی زبان اور تعلیمات کی اشاعت کشمیر میں مسلمانوں نے اقتدار سنبھالا تو مذہب و ثقافت کے ساتھ ساتھ زبان کا انقلاب بھی رونما ہوا۔ مسلمان سلاطین نے ملک میں فارسی زبان کو سرکاری اور درباری درجہ دے دیا جس سے سنسکرت زبان کا آفتاب غروب ہوا بلکہ دیکھتے

[۱] کلام شیخ العالم ص۱۵ [۲] کلام شیخ العالم: ص۷۷ [۳] کلام شیخ العالم: ص۵۶

دیکھتے کشمیر کے اُفق سے غائب ہی ہوگیا۔ سلاطینِ کشمیر نے ہندوستان کے بجائے وسطِ ایشیا اور عرب ممالک سے اپنے علمی اور فکری روابط قائم کئے جس سے فارسی زبان کشمیر کے چپے چپے پر پھیل گئی۔ نو وارد علما اور مبلّغین کی بول چال اور علمی زبان فارسی ہی تھی، اِس طرح فارسی زبان کا اثر دربار کے ساتھ ساتھ کوچہ و بازار پر بھی پڑا۔ اِس وقت کی فارسی زبان عربی الفاظ، محاورات اور اصطلاحات سے بھری ہوتی تھی جس میں صرف افعال اور حروف فارسی کے ہوتے تھے، گو اِس میں شک نہیں ہے کہ مزاج بہر حال فارسی اور فارسیت کا ہی ہوتا تھا مگر لغت کے اعتبار سے لوگ اِس زبان کی مدد سے فارسی سے زیادہ عربی سے آشنا ہوتے تھے۔

غرض فارسی زبان کی نشر و اشاعت اور ہزاروں غیر کشمیری مہاجرین کی فارسی بول چال سے عربی زبان کی خدمت ہوتی تھی۔ چنانچہ اِس زمانے میں جو بھی کوئی شخص فارسی کے توسط سے اِسلامی فکر و فنون سیکھتا تھا وہ لازماً عربی زبان کے ایک اچھے خاصے حصّے سے بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر واقف ہوتا تھا۔ اس میں کشمیر کے غیر مسلم بھی شامل تھے۔ یہاں کے غیر مسلموں میں سے ایک بڑی تعداد نے سنسکرت پر فارسی کو ترجیح دی جو بالآخر پنڈتوں کی گروہ بندی پر منتج ہوئی۔ فارسی زبان میں دلچسپی لینے والے ہندو اپنی برادری کے معتوب ہوئے۔ اِس لسانی تعصّب نے انھیں اپنے معاشرے میں بڑی ذہنی پریشانیوں میں مبتلا کیا تھا[1]۔

ہم یہاں ڈوگرہ شاہی دور کے ایک نامور مصنّف کی کتاب کا ایک اقتباس درج کرتے ہیں جس سے فارسی میں عربی کی آمیزش کا کچھ اندازہ

[1] تاریخ کشمیر (انگریزی) ڈاکٹر الحاج محی الدین صوفی ج ۲ ص ۷۸۹

لگایا جاسکے گا۔ اس کتاب سے ہماری مراد دیوان کرپا رام کی کتاب "گلاب نامہ" سے ہے جو گلاب سنگھ ڈوگرہ کے دورِ حکومت میں کشمیر کا وزیرِ اعظم تھا۔ یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مہاراجہ گلاب سنگھ کے حالاتِ زندگی، طرزِ حکومت اور اس کے جانشینوں سے تعلق رکھتی ہے مگر مصنف نے ابتداء میں حاکم کے حدوث قدم سے بحث کی ہے، جس کا عنوان یہ رکھا ہے:

"بیانِ دلیلِ چند بر حدوثِ عالم و اثباتِ صانع جلّت عظمتہٗ بطرزِ فلاسفۂ یونان و حکمت پژوہانِ ہندوستان۔"

آگے دیوان کرپا رام لکھتا ہے:

"بر دانایانِ دور بین و رمز شناسانِ مکامن یقین کہ تماشاییان رموزِ عالم و پردہ شناسانِ زیر و بم این ہفت انجمن اند پوشیدہ و مستتر نیست کہ اگرچہ نزدِ قوی عالم عالمیان را ابتدائے نیست لیکن اربابِ مِلَل کلہم و اصحابِ نِحَل باجمعہم قائل برآنند کہ اگر بوقلمونی و آثار و نیرنگی اطوار کہ در عالم یافتہ مے شود حدوثِ آں ثابت و متحقق است، اَلعالمُ حادِثٌ لِاَنّہٗ مُتَغَیّرٌ و کُلُّ مُتَغَیّرٍ حادِثٌ فالعالَمَ حادِثٌ، کہ این سخن وقتی مے شود کہ بیانِ چیز کردہ آید۔"

یہ اس دور کی فارسی ہے جب کشمیر میں علوم و فنون کے سوتے تقریباً خشک ہو گئے تھے اور جن جن مقامات کی علمی و فکری شادابی دیکھ کر عراق اور ایران کے طلبائے علم قلب و نظر کو آسودہ کرنے کی غرض سے وارد ہوتے تھے وہ اب تقریباً بنجر ہو گئے تھے۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شاہمیری اور مغلیہ دورِ حکومت میں جو چار سو سال پر محیط تھا، عربی علوم کی گرم بازاری کا کیا حال رہا ہوگا۔ ہم دیوان

کرپارام کی مذکورہ بالا کتاب میں بے حوالہ اخذ و اقتباس سے واقف ہیں مگر اسکی زبان دانی اپنی جگہ مسلّم ہے، آگے ہم اِسی دَور کی چند اور جلیل القدر شخصیتوں کا بھی حوالہ دیں گے۔

کشمیری زبان اور عربی رسم الخط جیساکہ بیان کیا گیا کہ کشمیر ہزار سال تک سنسکرت زبان اور ہندوستانی علوم کا مرکز تھا تاہم یہاں کی عام بول چال کی زبان کے بارے میں اختلاف کی گنجائش ضرور ہے۔ یہ مسلّم ہے کہ ٹھیٹھ سنسکرت زبان علوم و فنون کے ساتھ مخصوص تھی جبکہ عام بول چال کی زبان اِس سے قدرے مختلف تھی۔ سنسکرت بھی علاقائی زبان کے اثرات سے خالی نہیں تھی۔ اِس طرح تصنیف و تالیف کے لیے سنسکرت کا رسم الخط وہی تھا جو آج تک چلا آرہا ہے جبکہ علاقائی زبان کا رسم الخط مختلف تھا جو سنسکرت سے زیادہ "دیوناگری" سے مشابہت رکھتا تھا اور کشمیر میں یہ خط "شاردا" رسم الخط سے موسوم تھا۔ ابوالفضل نے لکھا ہے:۔

"اگرچہ اہلِ کشمیر زبانِ خود مے دارند لیکن اہم کُتبِ شاں بزبانِ سنسکرت باشد علاوہ ازیں ایں قوم رسم الخط دیگر دارد کہ در نسخہ ہائے قلمی اِستعمال کنند"۔ [1]

یہاں دیگر رسم الخط سے مراد اِسی "شاردا" سے ہے جو دیوناگری سے مماثلت رکھتا تھا اور کشمیری زبان کے لیے عرصۂ دراز تک مستعمل تھا۔

جب سنسکرت کی عمر کشمیر میں اختتام کو پہنچی اور فارسی یہاں کی دفتری اور علمی زبان بن گئی تو اِس کا براہِ راست اثر کشمیری زبان، علم و ادب اور

[1] آئینِ اکبری: ج ۲ ص ۳۵۱

رسم الخط پر پڑا۔ ایک طرف جہاں فارسی اور ترکی زبانوں کے بے شمار الفاظ اِس میں داخل ہوئے وہاں عربی الفاظ، اصطلاحات، محاورے اور تلمیحات کا ایک خاص ذخیرہ اِس میں جگہ پاگیا۔ دوسری طرف فارسی کے توسّط سے کشمیری زبان کے لئے بھی عربی رسم الخط رائج ہوکر مقبولِ خاص و عام ہوا، یہاں تک کہ اِس کے حروفِ تہجی تقریباً سب کے سب عربی کے ہیں۔ کشمیری زبان میں عربی الفاظ کے تناسب کے بارے میں وینی سیّاح VIGNE نے لکھا ہے کہ یہ تعداد دس فیصد ہے، جبکہ دوسری زبانوں کا حِصہ اِس طرح ہے [1]

سنسکرت = ۲۵ فیصد فارسی = ۴۰ فیصد

ہندی یا ہندوستانی = ۱۵ فیصد

تبتی، ڈوگری، ترکی وغیرہ = ۱۰ فیصد

عربی تلمیحات کا اِستعمال: حروفِ تہجی، رسم الخط، عروض و قوافی اور مواد و معلومات کے ساتھ عربی کی بے شمار تلمیحات کشمیری زبان میں عام ہوئیں جنکا تعلّق شعروادب، مذہب و اخلاق اور تاریخ و تصوّف سے ہے۔ لیلیٰ مجنوں، سلمیٰ، عذرا، رباب، دف، زبیر، بم وغیرہ عربی لٹریچر سے آئے ہیں، یہی حال یوسف اور زلیخا سے متعلق بھی ہے جو کشمیری ادب کا ایک خاص حصہ بن چکا ہے۔ مذہبی لٹریچر میں پیغمبروں کے واقعات جیسے ملکۂ سبا اور سلیمان، کوہِ طورؑ اور موسیٰؑ، تعمیر کعبہ اور حضرتِ ابراہیمؑ، نیز طوفانِ نوحؑ، صبرِ ایوبؑ، تختِ سلیمانؑ وغیرہ فارسی کی راہ سے کشمیری میں داخل ہوئے۔ مذہبی تلمیحات تقریباً ساری عربی سے ماخوذ ہیں جیسے جنّت، دوزخ، حشر و نشر، محشر، قیامت،

[1] وائن کی یہ تحقیق ڈاکٹر صوفی مرحوم اور پروفیسر محب الحسن صاحب دونوں نے اپنی کتابوں میں نقل کی ہے۔

جن و ملک، حور و قصور وغیرہ شعرائے کشمیر نے حضرت شیخ نورالدین ریشیؒ کے زمانے سے ہی کوئی دقت محسوس کئے بغیر اِن تلمیحات کو اپنے کلام میں برتنا۔ تاہم جیساکہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ مزاج بہرحال فارسی زبان و ادب ہی کا حاوی رہا۔ کیونکہ یہ تلمیحات عربی سے زیادہ فارسی کے اثر و رسوخ سے داخل ہوئیں۔ جو علماء عربی سے واقف تھے انہوں نے بھی عربی الفاظ و اصطلاحات کو انہی معانی میں استعمال کیا جو فارسی میں رائج تھے۔ اس کی زندہ مثال حضرت شیخ حبیب اللہ نوشہریؒ کی وہ عربی مثنوی ہے جس میں عربی کو صرف پوست کی حیثیت حاصل ہے جبکہ مغز و جوہر فارسی اور فارسیت کا ہے:۔

مذهب العشق مذهب واحد اِذهب علیه یا زاهد
انّا الحال ههنا منظور انّما القال ههنا مهجور

جہاں تک صوفیانہ ادب کا تعلق ہے تو وہ مکمل طور پر عربی اسلامی فن سے ماخوذ اور مستعار ہے۔ اگرچہ فکری اعتبار سے اس میں غیر مذاہب و نظریات کی آمیزش ضرور ہے مگر وہ آمیزش سارے اسلامی تصوّف پر مشتمل ہے صوفیائے اسلام کا اخذ و استفادے کا دائرہ شروع ہی سے وسیع رہا ہے۔ یہاں اس حقیقت کو اُجاگر کرنا مقصود ہے کہ وُرودِ اسلام کے بعد صوفیائے کشمیر نے اپنے واردات اور تجربات کے اظہار کے لئے صرف اسلام کی برگزیدہ شخصیات کو ہی اپنا مرکزِ توجہ بنایا اور انہی کی تقلید کی۔

فارسی کتابوں میں عربی مواد اور ماخذ

فارسی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ مِل جانے کے ساتھ ہی علمائے کشمیر نے فارسی میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا۔ چونکہ ان کے علم و تحقیق کا میدان مذہب اور تصوّف تھا، اس لئے لازماً عربی

کتابوں سے ہی مواد حاصل کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ اِن دو موضوعات پر جتنی بھی محققانہ کتابیں فارسی زبان میں لکھی گئی ہیں وہ زیادہ تر عربی کتابوں ہی سے ماخوذ اور مقتبس ہیں۔ اِس کی بہترین مثال حضرتِ علامہ داؤد خاکیؒ کی دستور السالکین ہے جو بنیادی طور پر حضرت شیخ حمزہ مخدومؒ کے احوال و مقامات سے تعلق رکھتی ہے مگر کتاب میں شریعت اور طریقت سے متعلق جن اہم مباحث اور مشکلات کو مصنف نے زیرِ بحث لایا اُنہیں تمام تر عربی کی مستند کتابوں ہی کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی وجہ سے یہ کتاب عربی کتب و رسائل کے طویل ترین اقتباسات سے لبریز ہے اور بعض مقامات پر حضرت مؤلفؒ نے اپنی آراء بھی فارسی کے بجائے عربی میں ہی پیش کی ہیں۔ شرح و متن کی جن چند کتابوں سے اُنہوں نے اپنی کتاب کو آراستہ کیا ہے۔ ان سب کا احاطہ کرنا یہاں ضروری نہیں تاہم چند کتابوں کے نام یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ کتبِ تفاسیر میں کشّاف، زاہدی، کاشفی، زنجانی، معالم التنزیل وغیرہ، کتبِ حدیث میں الجامع الصحیح للبخاری، مشکواۃ المصابیح، مشارق الانوار، فقہ اور اصولِ فقہ کی تالیفات میں شرح الوقایہ، اصول الشاسی، نوادر الاصول، تصوّف کی کتابوں میں عوارف المعارف، احیاء العلوم الدین، الرّسالۃ القشیریہ، فُصُوص الحِکم وغیرہ۔ اِسی طرح ایک اور کتاب اسرار الابرار کا نام بھی لیا جاسکتا ہے جس کے مؤلف سرکردہ عالم اور مصنّف شیخ داؤد مشکواتی (م ۱۰۹۰ھ) تھے یہ کتاب بظاہر کشمیر اور کشمیر سے باہر کے ممتاز ترین صوفیائے کرام کے حالات اور خدمات نیز تصوّف کے بعض نظری اور علمی مسائل کی شرح و تفصیل سے تعلق رکھتی ہے مگر اس میں بھی مصنّف نے عربی کے دینی اور فکری علوم سے

اچھی طرح سے اِستفادہ کیا ہے۔ اِسی وجہ سے علامہ سید سلیمان ندوی نے اِسے حدیث کی کتابوں میں جگہ دی ہے[1]۔ اور مولانا حبیب الرحمان اعظمی محدّث نے محدّثینِ ہند کے حالات بیان کرتے ہوئے اِس کتاب سے اِستفادہ کیا ہے[2]۔

فارسی کتابوں کے عربی خطبے اور تتمے

ماخذ اور مواد کے ساتھ ساتھ اِس دور کی مستند اور مشہور فارسی کتابوں کے خطبے عربی میں ہی لکھے جاتے تھے جو مصنفوں کی عربی دانی اور عربی میں لکھنے کی صلاحیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ہم یہاں نمونے کے طور پر دو کتابوں سے چند سطور پیش کرتے ہیں۔ حضرت داؤد مشکوٰتی محدثؒ اپنی تالیف اسرار الابرار کی ابتداء اِس طرح کرتے ہیں:-

الحمد لله الّذی جعل الذّوات استار الذاته لیکون منها الظهر و اخفی، وکوّن الممکنات آثاراً لصفاته فیعرف بها من کان فی اسفل و اعلی، وقدّر دار القرب و البعد فجعل الاولیٰ مزرعاً للاخریٰ، ونوّر قلوب العارفین بنور المعرفة الکریمة السبیّة العلیٰ وأشرق علی العارفین جمال قدسه فصنّفوا عن کلّ ماسواه سبحانه وتعالیٰ، وأنعم علینا الصراط المستقیم والدّین المتین والنعمة العظمیٰ، وذهب

۱؎ معارف، اعظم گڑھ بابت اکتوبر ۱۹۲۸ء: مقالہ زیرِ عنوانِ "ہندوستان میں علمِ حدیث"۔

۲؎ برہان، دہلی بابت فروری و مارچ ۱۹۵۴ء۔ مقالہ: "ہندوستان میں علومِ حدیث کی تالیفات"۔

بنور اهل الضلالۃ والطغیان والھویٰ، وترکھم فی ظلمات الحرمان صماً بکماً وعمیا، وشرف عین الحکمۃ بعین قدرتہ لینشر منہ نیرات العرفان والایمان والاھتداء ... ... " الخ

چودھویں صدی ہجری کے ایک سرکردہ عالم، صوفی صافی اور بلند مرتبہ شاعر شیخ محمد رادھو چشتی رح (جن کے پوتے شیخ عثمان زادھو حضرت شاہ ولی اللہ محدث شاہ کے شاگرد تھے) کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ شعر گوئی کے ساتھ ان کی مناسبت کا یہ حال تھا کہ صرف لا الٰہ الّا اللہ کی فضیلت پر ایک ہزار چار سو ستتر (۱۴۷۷) اشعار پر مشتمل رسالہ لکھا جو عُدّۃ اللّقاء کے نام سے ۱۳۲۷ء میں مطبع مجددی امرتسر سے شائع بھی ہوا ہے۔ اس رسالے کا خطبہ عربی میں لکھا ہوا ہے جس میں کلمۂ طیبہ کی فضیلت اس طرح بیان کی گئی ہے کہ ہر جملے کا ایک جُز بن گیا ہے۔ ہم اس خطبے سے بھی چند جملے نقل کرتے ہیں :-

یا اھل لا الٰہ الّا اللہ اکثروا من قول لا الٰہ الّا اللہ و کونوا ذائقین حلاوۃ حقیقۃ لا الٰہ الّا اللہ ولا تکونوا غافلین عن ملاحظۃ معنی لا الٰہ الّا اللہ فانھا بحرٌ عمیقٌ وغوامض اسرارھا دقیق لا یعلم کنھھا الّا اللہ ولا یدرک غورھا غیر اللہ ولا یعرف احدٌ سوی اللہ ...

... ... الخ

بعض علمائے جنہوں نے اپنا عربی ذوق محفوظ رکھا

فارسی زبان کی عام مقبولیت کے باوجود یہاں تقریباً ہر دور میں ایسے علماء بھی ہوتے ہیں جنہوں نے بساط بھر اپنے عربی ذوق کی حفاظت کی۔ اُنہوں نے عربی زبان میں مستقل کتابیں لکھیں اور کچھ مشہور و متداول کتابوں پر عربی ہی میں شرحیں لکھیں، چاہے اس کے لیے بازار موافق تھا یا نہیں۔ حضرت میر سید علی ہمدانیؒ اور ان کے فرزند میر سید محمد ہمدانیؒ عربی اور فارسی کے سرکردہ مصنف تھے۔ کشمیر کے علمی حلقوں میں ان کی کتابیں ہر دور میں مقبولِ خاص و عام رہیں۔ ان بزرگوں سے بھی قبل مُلّا احمد علامہ نے سلطان شہاب الدین کے عہدِ حکومت (۷۶۱ھ / ۱۳۵۵ء تا ۷۸۰ھ / ۱۳۷۳ء) میں عربی ہی میں اسلامی قوانین کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس کا نام اُنہوں نے سلطان کے نام پر "الفتاوی الشہابیۃ" رکھا تھا۔ پھر سلطان سکندر کے زمانۂ حکومت میں شیخ احمد سامانیؒ نے فرائض و میراث کی مشہور کتاب سراجی کی شرح نور السراج کے نام سے عربی میں لکھی جس کے نسخے آج بھی موجود ہیں اور شارح کے علم و فضل اور عربی زبان میں رسوخ و مہارت کا بیّن ثبوت ہے۔ چکوں کے دورِ حکومت میں یہاں عربی کے متعدد علماء اور اہلِ قلم موجود تھے جن میں سے بہت سے بزرگوں نے اُس زمانے کے عرب اور وسطِ ایشیاء سے تعلق رکھنے والے ممتاز علماء اور مصنفین سے براہِ راست اکتسابِ فیض کیا تھا، جن میں علامہ ابن حجر ہیتمی مکّیؒ اور مُلّا علی قاریؒ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ انہی فضلاء میں حضرتِ شیخ یعقوب عاصمی صرفیؒ، علامہ جوہر ناتت محدثؒ، محدث شمس الدین پالؒ، مُلّا فیروز گنائیؒ، حاجی محمد الکشمیریؒ، مولانا شنگرفؒ، اور شیخ زین الدین علی تنبورؒ بھی شامل ہیں۔ ان میں شیخ صرفیؒ اور حاجی محمدؒ

عربی کے ماہر مصنّف اور اہل قلم تھے۔ اِن کے زمانے کے فوراً بعد مُلّا سلیمان (م ۱۱۶۶ھ) پر نگاہ پڑتی ہے۔ جو مُلّا ابو الفتح کلّو (مؤلفِ "سیف السابین") کے فرزند اور مدرسہ عنایت اللہ خان کے ممتاز اُستاد تھے۔ انہیں عربی اور فارسی پر یکساں قدرت تھی۔ العاملی کی خلاصۃ الحساب پر اُنھوں نے عربی میں حاشیہ لکھا ہے جو بہت پہلے شائع بھی ہو چکا ہے[۱]۔ اسی طرح جملۂ صحابہ کرام کی عظمتِ شان پر بھی ایک مختصر رسالہ قلمبند کیا جس کا مختصر تعارف خاکسار مؤلف نے اس کتاب کے حصّہ اوّل میں پیش کیا ہے۔

سلطان محی الدین اورنگ زیب کے زمانے کے بلند مرتبہ عالم، مصنّف اور روحانی پیشوا خواجہ معین الدین نقشبندی (فرزند حضرت خواجہ خاوند محمود نقشبندی) عربی کے جلیل القدر عالم اور مصنّف تھے۔ عربی کتابوں میں ان کی ضخیم تفسیر قرآن سرِفہرست ہے، جو زُبدۃ التفاسیر کے نام سے موسوم اور آج بھی مختلف تاریخی کتب خانوں میں موجود ہے۔ فقہ میں اُنھوں نے چند سربرآوردہ علمائے کشمیر کی مدد سے ایک مجموعۂ قوانین عربی میں مرتّب کیا جو "الفتاویٰ النقشبندیہ" کے نام سے موسوم ہے اور محفوظ ہے، عقائد میں ردّ الملاحدۃ کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے جس کے نسخے موجود ہیں۔ بارہویں صدی ہجری کے اوائل میں علّامہ محمد محسن کھشّو کشمیری (۱۱۹۱ھ) عربی اور عربیّت کے متبحّر عالم اور مصنّف تھے بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ وہ اپنے معاصرین میں علمی تبحّر، مدرّسانہ شان، تحقیق پسندی، اور تحریری صلاحیت میں بے مثال تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنی علمی انفرادیّت اور اپنے زمانے میں علم کی کساد بازاری اور علما کی کم مائگی کا سخت احساس

---

[۱] CONTRIBUTION OF INDIA TO ARABIC LITERATURE By Dr. Zubiad Ahme

تھا جس نے انہیں معاصرانہ منافرت کا نشانہ بھی بنایا تھا۔ عین العلم کی اپنی بسیط فاضلانہ شرح کے پیش لفظ میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

فجاء بحمد اللہ تعالیٰ کما یرید قلبی و یخالج فی خاطری واعوذ باللہ من عین العنود المحسود ومن اَن یحوجنی الی تحسین الطبع الجمود۔ فانکار الاوّل منکر لا یجتنب وانقیاد الثانی معروف لا یُقبل، و اِلیٰ اللہ المشتکیٰ فھذا اوان لا یخلو فیہ احدٌ عن احدھما ولم یبق أثرٌ من العلم الّا الاسم الجھل حتیٰ صار اعلم الناس اجھلھم وحالی معھم کالمتکلّم مع الاصم والحی عند المیّت ولعل القیامۃَ قریب والساعۃ اقترب ولا یفصل خصومتنا الّا اللہ وھو احکم الحاکمین علیہِ توکلتُ الیہ انیبُ۔[1]

الحمد للہ یہ شرح میرے دل کی خواہش اور مزاج کے موافق ہوگئی۔ میں اللہ سے حاسد اور معاند کی نظرِ بد سے پناہ مانگتا ہوں، جس طرح اِن لوگوں کی خوشامد کا خواہشمند بن جانے سے نجات مانگتا ہوں جن کی طبیعت پر جمود چھایا ہوا ہے۔ پس حاسدوں کے حسد کی نکیر ایک ایسا منکر ہے جو ناقابلِ تصور ہے جبکہ جمود و تعطّل کے شکار لوگوں کی پیروی ایک ایسا "نیک" کام ہے جو ناقابلِ قبول ہے۔ اِس لئے گلہ و شکوہ سوائے خدا کے اور کسی سے نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں کسی شخص کا اِن بیماریوں سے محفوظ ہونا محال ہے۔ اب یہاں علم کا نام و نشان باقی نہیں ہے قوم کے سب سے بڑے جاہل قوم کے بڑے عالم بن گئے۔ میرا حال اِن کے

---

[1] شرح عین العلم (قلمی)

درمیان ایسے بولنے والوں کی ہے جو گونگوں
میں پڑا ہو یا ایسے زندے کی، جو مردوں میں
گرا ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ اب قیامت قریب
ہے اور وقت موعود نزدیک آ پہنچا ہے۔
میرے مخالفوں کا فیصلہ صرف اللہ ہی
کرے گا۔ وہ احکم الحاکمین ہے۔ میں نے
اسی پر بھروسہ کیا ہے۔ میرا رجوع اسی کی
طرف ہے۔"

اس اظہارِ ناراضگی سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ محسن کھشو ؒ اہلِ وطن بالخصوص طبقۂ علماٗ کی جانب سے ناقدری کا شکار ہوئے تھے۔ وہ زمانہ سچ مچ بڑی تیزی سے زوال و انحطاط کی طرف بڑھ رہا تھا اور زوال جب آتا ہے تو علماٗ کے مزاج اور مذاق کو بھی بگاڑ کر رکھ دیتا ہے الا ماشاء اللہ۔

مُلا محسن کے زمانے میں افغانستان کے دُرّانی حکمران کشمیر کو بیدردی سے لوٹنے، علم و دانش کے مرکز اُجاڑنے اور یہاں کے باشندوں کے ساتھ بہیمانہ سلوک کرنے میں مصروف تھے۔ اِن حالات میں یہ صرف علامہ محمد محسن ؒ اور ان کے چند تلامذۂ کرام کا وجود تھا جو تنگ و تاریک جھونپڑیوں میں بیٹھ کر علومِ اِسلامیہ کا چراغ اپنے خون کے قطروں سے روشن رکھے ہوئے تھے۔ سکھوں اور ڈوگروں کے دورِ اِستبداد میں عربی کے ماہر اساتذہ اور اہلِ قلم بزرگوں میں مفتی ابوالوفا، شیخ احمد واعظ اور مولانا سید سعید اندرابی کے اسماٗ گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ اِن میں شیخ احمد واعظ بلند مرتبہ خطیب، شاعر اور مصنّف تھے۔ احقر

ان کے ستر (۷۰) سے زیادہ علمی رسائل ہیں سے جو چند عربی رسالے حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے ان میں نجوم الشہابیہ اور تنبیہ الغافلین خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہی دو رسالے شیخ احمد کے علم و فضل اور تجربہ کار مصنّف ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ مفتی ابوالوفا فقہ کے ماہر عالم تھے۔ فقہ میں انکی یادداشت کا ایک ضخیم مجموعہ ریاستِ جموں و کشمیر کی ریسرچ لائبریری میں موجود ہے جو ۹۹۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

عربی علومِ آلیہ کے چند سرکردہ مدرّسین

اگرچہ عربی زبان میں تصنیف و تالیف کے لئے کشمیر کی فضا حوصلہ بخش اور ہمّت افزا نہیں تھی مگر عربی علوم کی درس و تدریس کی راہ میں نہ کوئی رکاوٹ حائل تھی اور نہ فضا ناموافق تھی بلکہ حق یہ ہے کہ یہ علمائے کشمیر کی تدریسی شان ہی تھی جس نے کشمیر کو صدہا سال تک ایران، افغانستان اور ملحقہ مسلم ریاستوں کے طلبائے علم کا مرکزِ توجہ بنایا تھا۔ یہاں ہر دور میں مستقل مدارس کے علاوہ مسجدوں اور خانقاہوں سے بھی درسگاہوں کا کام لیا جاتا تھا، اِس طرح درس و تدریس کا چرچا ہر طرف سنائی دیتا تھا۔

ہم نے اس کتاب کے حصّہ اوّل میں دینی علوم کے مشہور و ممتاز مدرّسین کی نشاندہی کی ہے، یہاں صرف عربیّت خاص طور پر علومِ آلیہ جیسے صرف و نحو، عروض و قوافی اور بیان و بلاغت کے چند سربرآوردہ مدرّسین کا نام لینے پر اکتفا کرتے ہیں جو ان فنون میں اپنے علمی تبحّر اور فنی بصیرت میں شہرت رکھتے تھے، اِس سلسلے میں ہم پہلا نام مُلّا بصر کا لے سکتے ہیں جن کے شاگردوں میں شیخ یعقوب صرفیؒ جیسے عربیّت کے ماہر شامل تھے۔ شیخ صرفیؒ اعتراف

کرتے ہیں کہ انہوں نے جملہ علوم کی تحقیل اِنہی سے کی تھی جن میں علومِ آلیہ بھی شامل تھے۔

فنِ منطق و اصطلاح و کلام
بدیع و بیان و معانی تمام

خواجہ علی بِتّو اپنے معاصرین میں صرف و نحو کے امام سمجھے جاتے تھے، مؤرخ محمد اعظم لکھتے ہیں :-

اوقات را صرفِ افادۂ علوم نحوی فرمود کہ غبطۂ اقران شد[۲]

اپنا وقت علوم نحو پڑھانے میں صرف کرتے تھے اور اس میں اتنے مشہور ہوئے کہ معاصرین اِن پر رشک کرتے تھے۔

خواجہ صاحب، حضرت صرفی اور شمس الدین پال محدّث کے شاگرد تھے اور حج بیت اللہ کے زمانے میں علّامہ ابنِ حجر مکیؒ سے بھی اِستفادہ کیا تھا[۳]۔ ایک اور عالم خواجہ محمد ٹو بیگرو نے بھی صرف و نحو کے مدرّس کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ خواجہ محمد اعظم لکھتے ہیں کہ صرف و نحو کے طلبأ اکثر انہی سے اِس کی تعلیم پاتے تھے۔

بدرس و بحثِ صرف و نحوے پرداخت و اکثر اہل علم ایں دو علم را ازو اِستفادہ نمودند[۲]

صرف و نحو کا محققانہ طریقے سے درس دیتے تھے اور اکثر علمأ نے یہ فنون انہی سے سیکھے تھے۔

علّامہ محمد محسن کھشوؒ دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ عربیّت کے بھی مدرّس اور

---

[۱] مغازی النبی، باب دوم، مطبع محمدی لاہور ۱۳۱۷ھ
[۲] تاریخِ اعظمی : ص ۱۳۵ [۳] ایضاً

مصنّف تھے۔ سطوسل پر اُنہوں نے فاضلانہ شرح لکھی تھی۔

تراجم کے دو سرکاری ادارے — سلطان زین العابدین نے اپنے عہدِ سلطنت میں مدارس کے ساتھ ایک مستقل دار الترجمۃ بھی قائم کیا تھا جس میں مختلف زبانوں کے ماہر علماء کو مختلف علمی کتابیں فارسی میں منتقل کرنے کا کام تفویض کیا گیا تھا۔ یہ علماء سنسکرت، فارسی، اور عربی شعبوں سے تعلق رکھتے تھے۔ تاریخوں میں اب صرف دو کتابوں کے نام محفوظ ہیں جن کا اس ادارے میں ترجمہ ہوا تھا۔ جن میں ایک یوسف زلیخا ہے جسے شری ور پنڈت نے سنسکرت میں منتقل کیا۔ دوسری کتاب پنڈت کلہن کی مشہور تاریخِ کشمیر (راج ترنگنی) ہے جس کا یہاں سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ ہوا اور جس کا نام بحر الاسمار رکھا گیا۔ یہی وہ کتاب ہے جس کی نظرِ ثانی مُلّا عبد القادر بدایونی نے اکبر کے حکم پر کی تھی۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اسے ایک ہندی افسانہ سمجھا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔

مشہور ڈوگرہ حکمران مہاراجہ رنبیر سنگھ نے بھی اپنے دورِ حکومت میں ترجمے کا ایک مستقل ادارہ قائم کیا تھا۔ گو اس کا واضح میلان کشمیر میں ہندو دھرم کی نہضت و احیاء کی طرف تھا مگر وہ مُلک کی اسّی فیصد مسلمان رعایا سے مکمّل غفلت بھی نہیں برت سکتا تھا۔ چنانچہ اس کا دربار جہاں ہندو دانشوروں سے بھرا رہتا تھا وہاں کچھ مسلمان اہلِ علم بھی موجود رہتے تھے۔ اس کے قائم کیے ہوئے ادارۂ تصنیف و ترجمہ میں عربی اور فارسی کے اہلِ قلم بھی ہوتے تھے۔ ان

لہ تاریخِ اعظمی: ص ۱۵۹

سہ دربارِ اکبری، مکتبۂ کلیان لکھنو۔ ص: ۱۲۸

علماء کو ایک سے تین روپیہ تک زائد معاوضہ دیا جاتا تھا جو فارسی اور عربی کتابوں کا ترجمہ سنسکرت میں کرتے تھے[1] رنبیر سنگھ کے درباری علماء میں مرزا اکبر بیگ، حکیم ولی شاہ لاہوری، سید غلام جیلانی، مولوی نصیر الدین، مولوی غلام حسین طبیب مولوی قلندر علی پانی پتی، مولوی عبداللہ مجتہد العصر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اسی طرح قادیانی مذہب سے تعلق رکھنے والوں میں حکیم نورالدین بھیروی اور عیسائیوں میں پابو نصراللہ اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ حکیم نورالدین نے اعتراف کیا ہے کہ اُسے مہاراجہ کی طرف سے مالی مدد ملا کرتی تھی[2]۔ اِن علماء میں خاکسار مؤلف نے صرف مرزا اکبر بیگ کی دس رسائل پر مشتمل ایک ضخیم جلد ریاستی ریسرچ لائبریری میں دیکھی ہے جو نہایت خوشخط اور مکمل ہے۔ اِن میں سے بعض رسائل کا تعارف اِسی جلد میں اپنے موقع اور محل پر پیش کیا جائے گا۔

سرکاری مدارس میں عربی تعلیم کی حالت

۱۸۹۲ء - ۱۸۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق کشمیر میں مسلمانوں کی آبادی ۷،۵۷،۴۳۳ تھی اور تمام سرکاری مدارس میں مسلمان طلباء کی کل تعداد "۲۳۳" تھی۔ اِس کے برعکس ہندوؤں کی مجموعی آبادی ۵۲،۵۷۶ تھی جبکہ ہندو طلباء کی تعداد ۱۳۲۲ تھی۔ یہ تفصیل لارنس[3] نے دی ہے جو اس زمانے میں کشمیر میں موجود تھے اور ایک معزز سرکاری عہدے پر فائز تھے۔

---

[1] A HISTORY OF KASHMIR : Dr. G. M. D SUFI VOL 2, P. 792

[2] مرقاۃ الیقین فی حیاۃ نورالدین : اکبر شاہ خان نجیب آبادی، بحوالہ بالا ج ۲ ص ۸۰۲

[3] THE VALLEY OF KASHMIR : Sir Walter Lawrance P. 228, 229.

۱۸۷۲ء میں سرینگر میں پانچ سرکاری مدارس تھے جن میں سنسکرت، عربی اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھانے کا انتظام تھا مگر طلباء صرف فارسی پڑھتے تھے۔ ان مدارس کے نام یہ تھے: مدرسۂ نوا کدل، مدرسۂ مہاراج گنج، مدرسۂ رعناواری، مدرسۂ بسنت باغ، اور مدرسۂ ایشہ کول، طلباء کی تعداد بالترتیب ۱۹۲، ۶۸، ۷۱، ۱۵۴ اور ۵۱ تھی[1]

ان مدارس کے علاوہ ایک مستقل عربی سکول کا تذکرہ بھی ملتا ہے جسے حکومت نے ایک انگریز ڈاکٹر کی درخواست پر قائم کیا تھا۔ تفصیل یوں بیان کی جاتی ہے کہ ڈاکٹر ایلمزی ELMSILE، نام کا ایک انگریز سرینگر وارد ہوا تھا۔ اس زمانے میں یہاں وبائی امراض بار بار پھوٹتے تھے اور ظالم حکام ان کے تدارک کی طرف غفلت برتتے تھے۔ اس سے متأثر ہو کر ڈاکٹر ایلمزی نے سرینگر میں ایک دوا خانہ کھولا۔ اس کے دوستوں میں ایک شخص شیر علی تھا۔ اس نے ڈاکٹر موصوف سے درخواست کی کہ وہ اس کے بچّوں کو انگریزی تعلیم پڑھائے۔ ڈاکٹر ایلمزی نے ذاتی مصروفیات کی بنا پر خود پڑھانے سے معذرت ظاہر کی مگر اپنے ایک معاون کو اس کام پر آمادہ کیا۔ جب ڈوگرہ حکمرانوں کو اس کا علم ہوا تو اُنہوں نے شیر علی کو جبراً روکا اور بچوں کو انگریزی پڑھنے سے منع کیا۔ ڈاکٹر ایلمزی یہ نیک کام انجام دینے سے مجبوراً باز رہا مگر اس نے ڈوگرہ حکمرانوں کو سرینگر میں ایک مستقل عربی مدرسہ کھولنے کا مشورہ دیا جسے حکومت نے منظور کیا مگر شرط یہ رکھی کہ اس میں صرف شرفاء کے بچے ہی داخلہ لے سکتے ہیں[2]۔ تنگ نظر حکمرانوں نے شرفاء اور غیر شرفاء کی قید ضرور لگادی مگر مدرسہ برائے نام بھی وجود میں نہ آسکا۔

[1] Srinagar : Dr. Ishaq Khan, P. 129

عربی تعلیمات کی اشاعت کا غیر سرکاری اِنتظام

مندرجہ بالا اعداد و شمار کی روشنی میں کشمیر میں عربی تعلیمات کا نام و نِشان بھی نہیں ہونا چاہئیے تھا۔ ڈوگرہ حکمرانوں کی اِس جانب متعصبانہ لاپرواہی عربی تعلیمات کا اثر و نفوذ ختم کرنے کے لئے کافی تھی مگر حکمرانوں کے ہاتھوں ایک دروازے کے بند ہوتے ہی قدرت نے دوسرے راستے کھول دئیے۔ کشمیر کے طالبِ علم شُمالی ہندوستان کی مختلف عربی درسگاہوں میں پہنچے اور وقت کے مشہور اور متبحر علماء سے فیضیاب ہوکر نکلے۔ یہ طلباء ہزارہ، مانسہرہ، سیالکوٹ، لاہور، جلال آباد، بریلی، دیوبند، علیگڈھ، لکھنؤ، فیض آباد وغیرہ کی مشہور دینی درسگاہوں سے فارغ التحصیل ہوکر نکلتے تھے۔ پنجاب کے مدارس خاص طور پر طلبائے کشمیر کے لئے مرکزِ کشش بنے ہوئے تھے یہاں بڑی کثرت سے طلباء عربی علوم حاصِل کرتے تھے جن کی تعداد یقیناً سینکڑوں تھی۔ ہم یہاں صرف مدرسۂ نُصرۃ الحق کے بارے میں مشہور مصنّف اور صحافی مُنشی محمد دین فوق مرحوم کا مشاہدہ درج کرتے ہیں۔ اُنہوں نے اس مدرسہ کے صدر مدرّس مولانا عبد الکبیر صاحب کشمیری مرحوم و مغفور (جنہیں بعد میں پنجاب سے بُلاکر ادارۂ اوقافِ اِسلامیہ سرینگر کی سرپرستی میں چلنے والی عربی درسگاہ مدینۃ العلوم حضرت بل کا پرنسپل مقرر کیا گیا تھا) کے حالات میں لکھتے ہیں:۔

"آپ کا قیام گو امرتسر میں ہے لیکن آپ کے چشمۂ فیض سے آپ کے ہموطنانِ کشمیر دیگر طلبائ سے زیادہ مستفیض ہو رہے ہیں۔ چنانچہ اِس وقت بھی اِس مدرسہ میں ۷۰ یا ۸۰ کے قریب طلبائ ہیں جن میں چند

لہ تاریخِ اقوامِ کشمیر: ج ۲ ص ۱۷، مطبوعہ لاہور ۱۹۴۳ء

ایک کے سوا تمام طلبا صرف کشمیر ہی کے رہنے والے ہیں۔ اس سے
ظاہر ہے کہ کشمیر میں آپ کی ذاتِ بابرکات پر آپ کے ہموطنوں
کو کس قدر اعتماد ہے۔[1]

دیوبند جہاں اُس زمانے میں تعلیمی معیار نہایت بلند تھا اور ہر طالب علم کے لیے داخلہ ناممکن ہوتا تھا، باایں ہمہ کشمیر کے طلبائے علم یہاں کے داخلے سے کبھی محروم نہیں رہے۔ ڈوگرہ دور میں ہی علامہ محمد انور شاہ کشمیری، میرواعظ مولانا یوسف شاہ، مولانا میرک شاہ اندرابی، مولانا یوسف شاہ وترہلی، مولانا عبدالکبیر ربنہ، مولانا سیف اللہ شاہ لولابی وغیرہم یہاں سے فارغ ہوکر نکلے تھے۔ علیگڈھ اُس زمانے میں موجودہ زمانے ہی کی طرح سر سید احمد خان مرحوم کی سائنسی دانشگاہ کی موجودگی سے مشہور تھا مگر اسی کے قرب وجوار میں حضرت مولانا لطف اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی عربی درسگاہ مدرسۂ لطفیہ عربی دینی علوم کے خواہشمندوں کیلئے موجود اور مشہور تھی۔ اور کشمیر کے جویانِ علم یہاں بھی پہنچتے تھے۔ چنانچہ مفتی سعدالدین صاحب اور ان کے برادر مفتی امان اللہ صاحب اِس درسگاہ سے اِستفادہ کرنے والوں میں شامل تھے اور مولانا لطف اللہ صاحب علیگڈھی کے خاص شاگردوں میں شامل ہوتے تھے۔[2] حضرت مولانا انور شاہ صاحب نے بھی اس مدرسے سے فیض حاصل کیا تھا۔[3]

جس انداز میں ظالم حکومت نے کشمیر میں منصوبہ بند طریقے پر اسلامی

[1] تاریخ اقوامِ کشمیر: ج ۲ ص ۱۷ مطبوعہ لاہور ۱۹۴۳ء

[2] اُستاذ العلماء: ص ۹۴

[3] رپورٹ سالانہ مدرسۂ لطفیہ عربیہ جامع مسجد علیگڈھ: ص ۱۱

علوم کے سوتے خشک کرنے کی کوشش کی (جس کی تائید مذکور الصدر اعداد و شمار سے بخوبی ہوسکتی ہے) اس کے برعکس کشمیر میں عربی اور اسلامی علوم کی تدریس و تعلم کا کوئی خاص وجود نہیں ہونا چاہئیے تھا مگر قدرت نے کشمیر کو علم کے اُس سمندر سے محروم نہیں رکھا جو کشمیر کی چار دیواری سے باہر پورے برصغیر ہند و پاک میں موجیں مار رہا تھا۔ طلبائے کشمیر نہایت خاموشی کے ساتھ ہندوستان کی دینی درسگاہوں سے فیضیاب ہو کر وطن واپس لوٹتے تھے اور یہاں بوسیدہ حُجروں اور خستہ حال مسجدوں میں قیام کر کے ابنائے وطن کو فیضیاب کرتے تھے۔ انہی مفتی امان اللہ صاحب اور ان کے بھائی مفتی سعد الدین صاحب کو لیجئے، وہ بہت کم اپنے حجروں سے باہر آتے تھے مگر ظالم حکمرانوں کے ایوان خدم و حشم سے کہیں زیادہ اُن کے کُلبۂ احزان پُر رونق ہوتے تھے۔ وہ جس قدر زیورِ علم سے آراستہ تھے اتنا ہی تقویٰ اور پرہیزگاری کا مجسمہ تھے۔ ان سے کچھ ہی سال پہلے اُن کی ہمسائیگی میں حضرت شیخ احمد واعظ (م ۱۸۷۵ء) دباغوں کے محلہ (متصل جمالٹہ سرینگر) میں درس و وعظ اور تحریر و تقریر کے ذریعہ ابنائے وطن کو رات دن سیراب کرتے تھے۔ یہاں وہ مسجد[1] آج بھی موجود ہے جہاں علم و تقویٰ

[1] یہ مولانا شیخ شیخ احمد کے نام سے ہی موسوم ہے۔ یہ مسجد مولانا ممدوح کے انتقال کے بعد بے توجہی کا شکار ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ اسی برس تک خستہ حال رہی۔ آج سے پچیس ۲۵ سال پہلے اس کی تعمیرِ نو ہوئی۔ خاکسار مؤلف کو اس کی زیارت سے جہاں قدرے اطمینان ہوا وہاں حضرت شیخ احمدؒ کی قبر دیکھ کر جگر شق ہوا۔ گنجان آبادی میں پڑے ایک چھوٹے سے قبرستان میں واقع ہے اور گندگی اور گندی نالیوں میں محبوس ہے اور اپنے جلیل القدر اسلاف کے تئیں ہماری بے حسی پر افسوس کا اظہار کرتی ہے۔ بزرگانِ دین کی قبروں کا احترام، جو حدودِ شریعت کے اندر ہو، خود ہمارے محترم ہونے کی دلیل ہے۔

کے اِس پیکرِ مجسّم نے سالہاسال تک تدریس و تربیت کی مشعل فروزاں رکھی۔ انکے دوست اور اُستاد بھائی مولانا سعید صاحب اندرابی نے ملارٹہ میں سرینگر میں یہی بساط بچھائی تھی اور شہر و دیہات کے تشنگانِ علم کو سرکاری مدارس سے بالکل بے نیاز کر دیا تھا۔ بارہمولہ میں مولانا محمد جو جندلؒ اپنی درسی خصوصیات میں بڑی ناموری حاصل کر چکے تھے ان کی عظمت و بزرگی کے لیے صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ علامہ محمد انور شاہ صاحبؒ نے ابتدائی تعلیم انہی سے حاصل کی تھی۔ اپنے ایک علمی رسالہ میں حضرت شاہ صاحبؒ نےؒ اِن کا نام اِن الفاظ میں لیا ہے:۔

"... تا آنکہ مولائی و استاذی و ملجائیُ و ملاذی حضرت مولانا غلام محمد ادامہُ اللّٰہُ بالمجد والسوددُ اشارت فیض بشارت فرمودند...."[1]

فارسی زبان وادب کا تو ذکر ہی نہیں۔ اِس دورِ ظلمت و حسرت میں کشمیر کا چپہ چپہ فارسی کے جلیل القدر علماء سے معمور تھا۔ جن میں ہر ایک اپنی جگہ ایک ادارے کا کام انجام دینے کے قابل تھا مگر نامساعد حالات اور حوصلہ شکن حوادث نے ان کی امیدوں اور صلاحیتوں کو اندر ہی دفن کر کے رکھ دیا تھا اِس سلسلے میں صرف تاریخِ حسن کا نام لینا کافی ہو گا جو معلومات کا گنجینہ ہے اور مؤلف کی حوصلہ مندی، ژرف نگاہی اور محققانہ بصیرت کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ اگر اسے والٹر لارنس کی صحبت اور مساعدت حاصل نہ بھی ہوئی ہوتی تو بھی وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار نہ لا سکتا تھا۔ ایک اور عالم، ادیب اور شاعر مولانا عبدالقادر آثم ملارٹی مرحوم کا ذکر بھی یہاں بے محل نہیں ہو گا۔ آج تک اُن کی صرف دو چار نظمیں ہی شائع ہو چکی ہیں مگر یہی محدود کلام آثم صاحب کی عظمت و جلالت کا اندازہ لگانے کیلئے

[1] تحلیل الذّبائح فی حریم الصّرائح: مولانا محمد انور شاہ کشمیری: ص ۵، نشاط پریس سرینگر

کافی ہے۔ اُنہوں نے ایک طویل نظم جو ۹۴ اشعار پر مشتمل ہے حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے انتقال پر لکھی ہے ہم یہاں اس کے بارہ بندوں میں سے صرف ایک بند نقل کرتے ہیں :-

وقت آں است اگر روحِ بخاری گرید
ترمذی آمدہ چوں ابرِ بہاری گرید
نسائیٔ وار مسلّم غم او مُسلم راست
نووی عود نوا گزشتہ بزاری گرید
آں تقریرِ مصفّای موطا کہ کند
عبد شام و سحرے بر در باری گرید
وائے آلودہ باندوہ ابو داؤد است
عونِ معبود و بصد سینہ فگاری گرید
دلِ مشکواۃ ہمی سوزد مرقات اُفتد
بغوی زار، ہمینالد و قاری گرید
بحرِ موّاج رسد گز پئے آں عین العلم
زندہ رودی کشد از ہر مژہ جاری گرید
صدمۂ وصلش از طبری و رازی پرسید
شیوۂ قاضیٔ بیضاست ز باری پرسید
باز خواہم کہ بیانے ز تو آغاز کند
باشارات لبش شرح شفا باز کند

ایران میں صرف یہی ایک نظم شاعر کو زندہ جاوید رکھنے کے لیے

کافی تھی مگر یہاں یہ حال ہے ؎

تو نظیری زِ فلک آمدہ بودی چو مسیح

باز پس رفتی کس قدر تو نشناخت دریغ

غرض اِس تاریک دَور میں ظاہری طمطراق اور گہما گہمی کے بغیر عربی تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ قصبوں سے لیکر دُور افتادہ دیہاتوں تک تنگ دست اور خستہ حال علمائ تنگ و تاریک کونوں میں سمٹ کر مٹّی کے دیئے روشن کرکے مدارک التنزیل، تفسیر بیضاوی، تفسیر کشّاف، تفسیرِ جلالین، صحاح سِتہ، مشکوٰۃ المصابیح، طحاوی شریف (معانی الآثار) ھدایہ، ردّ المختار، دُرّ المختار، کنزالدقائق، عوارف المعارف، احیاءُ العلوم، شفاءِ قاضی عیاضِ مالکی اور امام رازی کی مطالب عالیہ جیسی علمی اور فکری کتابوں کا نہ صرف مطالعہ کرتے تھے بلکہ طلباء کو درساً پڑھاتے تھے۔ علمائ یہ خدمت عموماً فی سبیل اللہ انجام دیتے تھے۔ اِن کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی، دستکاری اور کتابت ہوتی تھی۔ خود خاکسار مؤلف کا تعلق جس گھر سے ہے صرف ایک پشت پہلے وہاں دینی تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ دستکاری کا مستقل مشغلہ بھی موجود تھا جو لوگ صبح اور شام کو معلّم و مدرّس ہوتے تھے وہی دن میں سوت اور ریشم کا کام اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے اور یہی ان کے معاش کا ذریعہ بھی تھا۔

بہت سے مقامات پر مرد اور عورتیں مقامی مکتبوں جن سے کوئی محلّہ خالی نہیں تھا، میں دینی تعلیم پاتی تھیں وہ قرآنِ حکیم کے بعد اوراد فتحیہ، حصن حصین، دلائل الخیرات اور عارفانہ کلام میں قصیدہ البُردۃ، قصیدۃ الخمریۃ فارضیۃ اور اور قصیدۃ الخمریۃ قادریہ وغیرہ نہ صرف التزام سے پڑھا کرتے تھے بلکہ زبانی

بھی یاد کرنے تھے۔ یہ سب کچھ علم برائے علم اور علم برائے اسلام کے لیے ہوتا تھا۔ گو دنیا کے بازار میں اسے کوئی اہمیت نہیں تھی مگر قلب و روح کے مطمئن مسلمان بھی اسے خرید و فروخت کے مال کے طور پر حاصل کرنے کے روادار نہیں تھے۔

موجودہ عربی درسگاہیں اور ان کا کردار: موجودہ صدی کے نصف اوّل میں برصغیر کے ہزاروں عربی اداروں میں جو مدرسہ اعلیٰ تعلیمی معیار، اساتذہ کے علمی تبحّر اور مدرّسانہ کمالات، بلند تحقیقی اور تنقیدی مذاق اور منتظمین کے اخلاص اور انتظامی صلاحیت میں سب سے زیادہ مشہور تھا وہ دارالعلوم دیو بند تھا۔ چنانچہ کشمیر کے جویائے علم یہاں بھی پہنچے اور اس منہل صافی سے کھل کر استفادہ کیا۔ فراغتِ علمی کے بعد کچھ لوگ کشمیر سے باہر ہی رہے اور کچھ نے وطن لوٹ کر یہاں مدارس قائم کئے۔ ان مدارس میں "نصرۃ الاسلام" (اسلامیہ اورینٹل کالج) اور مدینۃ العلوم (حضرتبل) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ آج اگرچہ ان مدارس کی حالت "تبرک" سے زیادہ اہم نہیں رہی ہے مگر جب ان میں علم و تدریس کا غلغلہ شباب پر تھا تو ریاستِ جموں و کشمیر کا ہر گوشہ اس سے فیضیاب ہوتا تھا۔ سرینگر سے زیادہ سرحدی اضلاع سے تعلّق رکھنے والے طلبائے علم یہاں داخلہ لیتے تھے اور فارغ ہوکر دور و دراز کے علاقوں میں عربی دینی تعلیم پھیلاتے تھے۔ مدرسۂ "نصرۃ الاسلام" کے نامور اساتذہ میں سے جن بزرگوں کو خاص شہرت حاصل ہوئی اور جنہوں نے درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف میں بھی سرگرمی سے حصّہ لیا، ان میں مولانا محمد یوسف شاہ صاحب میر واعظ (سابق صدرِ مدرّس)، مولانا مفتی محمد شاہ سعادتؒ مولانا عبدالقدوس قاسمی، مولانا محمد قاسم شاہ بخاری (سابق صدرِ مدرّس) اور پروفیسر محمد ابراہیم کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں مولانا عبدالقدوس صاحب تقسیم ہند کے

بعد پاکستان چلے گئے جہاں اُنہوں نے اعلیٰ پایہ کی علمی اور تحقیقی خدمات انجام دیں۔ وہ پشاور یونیورسٹی میں عربی اور اسلامیات کے شعبوں کے صدر بھی تھے۔ جن ایام میں وہ کمال الدین عبدالرزّاق بن احمد الشیبانی معروف بہ ابن فوطی (م ۷۲۳ھ) کی تصنیف "تلخیص مجمع الآداب فی معجم الالقاب" کی تصحیح وتعلیق کا کام کرتے تھے اور اسے اورنٹل کالج میگزین لاہور میں بالاقساط شائع کرتے تھے، اُس زمانے میں وہ اورنٹل کالج نصرۃ الاسلام سرینگر میں بحیثیتِ مدرّس تدریسی فرائض انجام دیتے تھے۔ چنانچہ میگزین میں ان کے نام اور کام کے ساتھ "مدرّسِ نصرۃ الاسلام سری نگر کشمیر" بھی لکھا ہوتا تھا۔

کشمیر اور شعر و سخن

وادیٔ کشمیر کا قدرتی حسن اہلِ فن کے لئے سازگار اور شعر و شاعری کے لئے بطورِ خاص موزون ہے۔ عراق کا ایک جدید شاعر خالصی کشمیر کے حسن سے مسحور ہو کر پکارتے ہوئے کہتا ہے:-

ایہ کشمیر ذی الجبال الرّواسی — بسفوحٍ مخضرّۃٍ وھضاب
غطیت "بالچنار" مثل عروس — کُللت بالزّھور یوم الکتاب
وھبوب النسیم من کلّ صوب — وغناء الطّیور فی کُلّ غاب
والمتاع الثّلوج فوق رؤس — من جبالٍ شمّضٍ عبر السحاب
ھاھنا ھاھنا الجمال تجلّی — ھاھنا ھٰھنا نبیتُ الّذی بی
ھاھنا ھٰھنا لطیب اللیالی — ھاھنا ھٰھنا یلذّ شرابی[1]

"کشمیر کا کیا کہنا! جو ایسے پہاڑوں اور ٹیلوں سے مالا مال ہے جن کے دامن صاف اور شاداب ہیں۔ چناروں کے درختوں سے ڈھکا ہوا کشمیر، ایک ایسی دلہن کے مانند ہے جسے روزِ ازل ہی میں پھولوں کا تاج پہنایا گیا ہے۔ جہاں ہر طرف بادِ نسیم کی کارگزاری ہے۔ جہاں ہر جھاڑی کے پرندے گیت گاتے ہیں۔ جہاں ایک ایک پہاڑ اتنا بلند ہے کہ بادلوں کو چھو رہا ہے۔ وہ پہاڑ، جن کی چوٹیوں پر برف چمک رہی ہے۔ صرف اسی جگہ اپنا جلوہ دکھاتا ہے، یہیں راتیں خوشگوار لگتی ہیں اور یہیں شراب مجھے لذّت بخشتی ہے۔"

[1] مجلّہ "ثقافۃ الھند" دہلی ستمبر ۱۹۵۵ء

کشمیر کے شعراءکسی بھی دَور میں شعروشاعری کے میدان میں دوسروں سے پیچھے نہیں رہے جس زمانے میں یہاں سنسکرت زبان رائج تھی سنسکرت شعر و شاعری کا بازار بھی گرم تھا بلکہ اکثر مصنّفین اپنی فکری اور علمی تحقیقات کو بھی سنسکرت اشعار میں ہی نظم کرتے تھے۔ یہاں تک کلہن پنڈت نے اپنی تاریخ کشمیر راج ترنگنی کی تالیف کے لئے بھی نثر کے بجائے نظم ہی کو ترجیح دی۔ ماضی قریب تک محقّقین کا ایک طبقہ اِس بات کا دعویٰ کرتا تھا کہ کالیداس کشمیر الاصل تھا۔ اگرچہ اب یہ دعویٰ ساقط الاعتبار قرار دیا گیا ہے مگر اُن سینکڑوں شعراء کا نام سنسکرت شعروادب کی تاریخ سے محو نہیں ہوگا جنہوں نے منظوم سنسکرت میں ادب کے عام اصناف خصوصاً تاریخ، فلسفہ اور فحش نویسی "PORNOGRAPHY" میں نام پیدا کیا[1]

سنسکرت کے بعد فارسی زبان رائج ہوئی اور پورے چارسو سال تک اپنے آغوش کو مالا مال کرتی رہی۔ اِس دوران کشمیر نے ایسے مقتدر شعراء پیدا کئے جن کے فضل و کمالات کا اعتراف ایران کے اہلِ زبان اور باذوق شعراء نے بھی کیا۔ مُلّا طاہر غنی، شیخ یعقوب صرفی، شیخ حبیب اللہ حُبّی، مُلّا محسن فانی، مرزا اکمل الدین خاں بدخشی، داراب جویا، کامران گویا وغیرہ جیسے سربرآوردہ شعراء کی شاعری اور شعری صلاحیت کا لوہا سخنورانِ ایران نے بھی مان لیا ہے۔ مغلوں کے عہدِ سلطنت میں کشمیر ایشیاء کے عظیم المرتبت شعراء کا مرکزِ ثقل بن گیا۔ جن میں سے بہت سی شخصیتیں مستقل طور پر کشمیر میں ہی ٹھہریں اور یہیں پیوندِ خاک بھی ہوئیں۔ بابا طالب اصفہانی، محمد جان قدسی، طغرائے مشہدی، مرزا طالب کلیم

[1] CULTURAL HERITAGE OF KASHMIR : S.C. BENERJI, P-6

وغیرہ انہی میں شامل ہیں۔ ایک طویل سفر طے کرنے کے بعد فارسی بھی کشمیر میں تھکاوٹ کے مرحلے میں داخل ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنا دامن ہی سمیٹنے پر مجبور ہوئی۔ اب علاقائی زبان اور اِس کے دوش بدوش اردو زبان کھل کر منظرِ عام پر آئی اور یہاں کے شعراء نے اپنے مافی الضمیر کی ابلاغ و ترسیل کے لیے عوام الناس کی زبان اختیار کی۔ اِس طرح کشمیری زبان بہت جلد ارتقائی منزلیں طے کر کے ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہوئی۔

کشمیری زبان کے دو قدیم شعراء نے کشمیری شاعری اور شعراء پر کافی اثر ڈالا یہ دو محترم ہستیاں حضرت شیخ نورالدین ریشی اور للّہ عارفہ کی ہیں۔ دونوں روحانی تجربات کے زیور سے آراستہ تھے اور بصیرت کی گہرائی میں کسی بڑے سے بڑے عالمی شہرت یافتہ شاعر و ادیب سے کم نہیں تھے۔ للّہ عارفہ یا للّہ دید یا للیشری پر فنائیت غالب تھی۔ شادی کے فوراً بعد یہ مجذوب دنیا سے اپنے تمام رشتے منقطع کر کے حقائق عالم کے کھوج میں کھو گئی اور مختلف اور مناسب مواقع پر ایسے واردات اور تجربات کو پیش کرنا شروع کیا جنہوں نے اپنی گہرائی اور گیرائی کے لحاظ سے اسے ایک ممتاز اور منفرد مقام عطا کیا۔ مولانا ابو المحفوظ الکریم معصومی نے اِس کے چند اشعار کو عربی کا جامہ پہنایا ہے اگرچہ ترجمے میں اصل جیسی جاذبیت برقرار نہیں رہتی ہے تاہم اسے نظرانداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں ہم ایک قطعہ کا عربی ترجمہ نقل کرتے ہیں:۔

ما انضر وجهك السار، إلّا ان قلبك (يشبهُ) صخرةً
حيث انّ الحقيقة لم تؤثر فيك اصلاً
تقلّصت شفتاك، وتشنّجت انا ملك، لطول عهدك

بالقراءۃ والکتابۃ
وَبَعدَ فانَ ضَغِینَۃَ صَدرِکَ لَم تَسلِل عَنکَ قَطُّ

"تمہارا چہرہ بظاہر کتنا تازہ و شاداب نظر آتا ہے، مگر تمہارا دل صلابت میں بدستور پتھر کے مانند ہے۔ تمہاری راہ میں یہ سنگدلی اِس طرح حائل ہے کہ حق و صداقت تیرے اوپر کوئی اثر پیدا نہیں کرتی۔ ایک لمبی مدت سے پڑھتے پڑھتے اور لکھتے لکھتے تمہارے ہونٹ سکڑ گئے اور تمہاری انگلیوں کے پوروں پر جھریاں پڑ گئیں۔ مگر اس کے باوجود تمہارے سینے کا بغض و عناد اب بھی تم سے دور نہ ہو سکا۔"

للہ کی عظیم باطنی بصیرت، متلاطم دِل اور غیر معمولی فکری گہرائی کا یہ ثمر ہے کہ پچھلے چھ سو سالہ مدت میں اگرچہ کشمیر نے عظیم ترین شعراء پیدا کئے مگر للہ عارفہ کی جگہ ابھی تک خالی ہے۔ کہتے ہیں کہ للہ برہنہ پھرا کرتی تھی۔ اِسی دوران اسلام کے نامور مبلّغ اور داعی میر سیّد علی ہمدانیؒ کشمیر داخل ہوئے۔ وہ ایک دن للہ کے سامنے سے گزرے۔ وہ انہیں دیکھتے ہی پکار اُٹھی "میں نے آدمی کو پالیا" یہ کہہ کر اپنا جسم ڈھانپنے کے لئے دوڑ پڑی [1]۔ غرض للہ اس مقام پر پہنچ چکی تھی جہاں اِنسان شرعی حدود کا مکلّف نہیں رہتا۔ اِس لیے اِس کے اشعار کو کھینچ تان کر شاعرہ کو کسی خاص مذہب کا مقلّد ثابت کرنے کی کوشش بے مقصد ورزش ہے [2]۔

---

[1] ملاحظہ ہو مقدمہ کتاب THE WORD OF LALLA, THE PROPETESS
مترجم: SIR RICHARD CARNAC TEMPLE
مطبوعہ ۱۹۲۴ء کیمبرج

[2] رچرڈ ٹمپل کے ترجمے کے علاوہ ہمارے محترم دوست پروفیسر کول نے حال ہی میں ایک اور عمدہ ترجمہ شرح "THE ASCENT OF SELF" کے نام سے کیا ہے، یہ ترجمہ بھی راقم کے پیشِ نظر ہے۔

دوسرے بزرگ شیخ نورالدین ریشی (ولادت ۱۳۷۷/۱۴۳۸ء) تھے جو فطرتاً ولیِ کامل اور صاحبِ بصیرت مرشد واقع ہوئے تھے۔ ان کی زندگی کے کچھ نمایاں خدّوخال اور عربی تعلیم کی طرف ترغیب و تحریص دلانے میں کامیاب رول کی طرف ہم نے اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں کچھ اشارات کئے۔ شیخ بلند مرتبہ کشمیری شاعر تھے جو صرف اپنی ہم عصر شاعرہ للہ سے مشابہت رکھتے تھے۔ ان کی شاعری کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ یہ قرآن و حدیث ہی کی شرح و تفسیر ہے۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ شیخ کے اشعار کائنات کے اسرار و رموز اور الٰہی معارف سے پُر ہیں مگر ان میں اصلاح کا عنصر غالب ہے۔ وہ اپنے ہی زمانے میں اپنی روحانی بزرگی اور کمالات میں مشہور ہوئے۔ اگر ایک طرف سرکردہ مشائخ آپ کی عزّت کرتے تھے تو دوسری طرف سلاطین بھی آپ کی بوریائے فقر کے آگے فخر سے جبہ سائی کرنے حاضر ہوتے تھے۔

شاہمیری دور کے خاتمے کے بعد ہی کشمیری شاعری ترقی کی راہ پر گامزن ہونے لگی۔ اس کے عُروقِ مردہ میں اس وقت نیا خون دوڑنے لگا جب چک دور کے نامور حکمران یوسف شاہ کی محبوبہ "حبہ خاتون[1]" منظرِ عام پر آگئی اور اپنی نواسنجی سے اہلِ وطن کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔ وہ اصلاً ایک غریب کاشتکار کی بیٹی تھی جو ڈرامائی طور پر سلطانِ کشمیر کی محبوبہ بن گئی۔ سلطان یوسف شاہ خود شعر و ادب اور ساز و سنگیت میں گہری دلچسپی رکھتا تھا جس سے حبہ خاتون کی شعری صلاحیت کو بھی جِلا مل گئی۔

---

[1] حبہ خاتون کی حیات اور شعری کمالات پر کافی مواد موجود ہے۔ اس میں اُستادِ محترم پروفیسر محی الدین حاجنی صاحب کی تحقیقات بھی شامل ہیں۔

عربی شاعری ہمیں تاریخ ادبیاتِ کشمیر میں کوئی ایسا شخص نہیں ملا جس نے عربی شاعری کو ایک مستقل فن کے طور پر اپنایا ہو۔ تاہم یہ کمی کشمیر ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ساری ہندوستانی عربی شاعری کے بارے میں بھی یہی کہا جاسکتا ہے۔ یہاں بھی عربی میں انہی لوگوں نے طبع آزمائی کی ہے جو بنیادی طور پر دوسرے علوم کے مردِ میدان تھے۔ میر سید علی ہمدانیؒ فکری اور عملی تصوف کے عالم اور محقق تھے مگر شعر و ادب کا ذائقہ بھی رکھتے تھے۔ آگے یہی سلسلہ جاری رہا۔ یہاں عربی میں انہی علماء نے شعر کہے ہیں جو علوم میں بھی مہارت رکھتے تھے۔

حضرت میر سید علی ہمدانیؒ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے اہلِ کشمیر کو عربی شاعری سے متعارف کیا۔ ان کی تصانیف میں شعرائے متقدمین کے اشعار ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے شیخ ابو حفص شرف الدین عمر بن الفارض (م ۶۲۳ھ) کے مشہور قصیدہ خمریہ کی فارسی میں شرح لکھی ہے۔ اس قصیدے کا مطلع یہ ہے:۔

شربنا علیٰ ذکر الحبیب مدامۃً
سکرنا بھا من قبل ان یخلق الکرم[۱]

یہ شرح آج بھی نہ صرف موجود ہے بلکہ مشہور ہے کہ اس کا اردو میں ترجمہ بھی ہوا ہے۔

شاہمیری دور میں ہمیں کسی بھی ایسے عالم یا ادیب کا پتہ نہیں چلتا جس نے عربی میں شعر گوئی کی ہو، اسی طرح عربی ذخیرہ میں بھی کسی شعر یا نظم کا سراغ نہیں ملتا ہے۔ البتہ سلطان حسن شاہ (فرزندِ سلطان زین العابدین بڈشاہ) کے عہدِ حکومت میں ایک صاف باطن اور روشن ضمیر بزرگ شیخ شہاب الدین

---

[۱] دیوان ابن الفارض: مرتبہ: خلیل الخوری، بیروت ۱۸۹۹ء

یہاں وارد ہوئے وہ سندھ سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر بالآخر کشمیر ہی کو اپنا وطن بنایا اور نوا کدل سری نگر کے مضافات میں دفن کئے گئے تھے[1] اِن کے بارے میں منقول ہے کہ کشمیر تشریف لانے پر یہاں کے فطری مناظر سے متأثر ہو کر یہ دو شعر کہے تھے :۔

کانَ الکشمیر و سُکّانہا جنّتُ عَدنٍ ھِیَ للمؤمنین

قد کتب اللّٰہُ علیٰ بابِہا مَن دَخلَہٗ کان مِن الآمنین

(کشمیر اور اِس کے باشندوں کی مثال ایسے جنّت کی ہے جو صرف ایمان والوں کے لئے مخصوص ہے۔ خدا نے اس کے دروازے پر یہ ثبت کیا ہے کہ جو بھی اس میں داخل ہو جائے گا اُسے امان ملے گی۔)

ملکۂ حبّہ خاتون کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ اُسے عربی اور فارسی شاعری سے شناسائی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے قیس عامری کے ایک شعر کا مفہوم کشمیری زبان میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے[2]۔ بعض کشمیری شعرا نے اپنے اشعار کو عربی اقتباسات سے آراستہ کیا جن کا تعلق قرآن اور حدیث کی کتابوں سے ہے، مثلاً محمود گامی کی ایک نظم کے چند اشعار کا دوسرا مصرعہ " وَھُوَ حیٌّ لا یموت " ہے، دوسری نظم کا ایک شعر یہ ہے :۔

یا الٰہی کر اجابت در دُعا ربِّ اِغفِر لی ذنوبی کلّہا

---

[1] تاریخ حسن : ج ۳ ص ۲۲۲ ، کوہ نور پریس سری نگر ۱۹۶۰ء

[2] پوری تفصیل کے لئے مرحوم عبدالاحد آزاد کی کشمیری ادب اور شاعری کی تین جلدوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے، جسے ریاستی اکادمی نے معیاری شکل وصورت میں شائع کیا ہے۔

ایک اور شعر اس طرح ہے :-

محمودہ مرن عاشقن ہُند زان تہ عیداہ
مَنْ ماتَ مِنَ العشق فقد ماتَ شہیدا

محمود کے علاوہ اس کے بعض سرکردہ معاصر شعراء کے منظوم کلام میں بھی اس طرح کی مثالیں ملتی ہیں ۔ ان میں شاہ غفور ، میر شاہ آبادی ، عبدالاحد ناظم ، مہدہ شاہ دیکہ وغیرہ کے نام ذکر کے قابل ہیں [۱]

عربی کے چند مشہور شعراء اور ان کا نمونۂ کلام

مؤلف کو تلاش بسیار کے بعد ایسے بہت کم بزرگ ملے جو عربی میں طبع آزمائی کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے ۔ وہ علماء جو عربی شعر و ادب میں ماہرانہ بصیرت رکھتے تھے ، ان میں متقدمین میں حضرت ایشاں شیخ یعقوب صرفیؒ اور متاخرین میں محدث العصر علامہ محمد انور شاہ اور ان کے تلمیذِ رشید مولانا میرک شاہ اندرابی قابل ذکر ہیں ۔ کچھ بزرگوں نے اس میدان میں ضمناً قدم رکھا ہے ۔ شیخ حبیب اللہ نوشہری سیف الدین تارہ بلی انہی میں شامل ہیں ۔ ان میں اول الذکر فارسی ...... اور موخر الذکر کشمیری زبان کے مسلّم الثبوت شاعر تھے ۔ موضوعاتِ شعر تقریباً مشترک ہیں ، یعنی نعت ، مناجات ، تصوّف ، اخلاق اور حکمت ۔ علامہ انور شاہ صاحب جس طرح مختلف علوم میں مہارت رکھتے تھے ، اسی طرح اُنہوں نے شعر و شاعری کے میدان میں بھی درک و کمال کا ثبوت فراہم کیا ہے ۔ غزل ، مرثیہ ، مدح فلسفہ ، حکمت ، نعت و منقبت ، تقریظ ، اصلاح وغیرہ اِن کے ہزاروں اشعار کے متنوع مضامین ہیں ۔ وہ اِس اعتبار سے ہندوستان کے چند گنے چنے شعراء میں شامل

---

[۱] تفصیل کے لئے "کشمیری ادب اور شاعری" جلد ۱، ۲، ۳ ملاحظہ کیجئے ۔

کئے جاتے ہیں۔ طبیعی شاعری موقع اور محل ساز گار ہونے کے باوجود مفقود ہے، اور ان کی جانب بالکل بے رغبتی برتی گئی ہے۔

صرفی حضرت شیخ یعقوب صرفی کشمیر کے جامع الکمالات بزرگوں میں سے تھے۔ ہم نے اِس کتاب کے حصّۂ اوّل میں ان کی حیات اور کمالات کا تعارف پیش کیا ہے۔[1] وہ نہ صرف سربرآوردہ محدّث، مُفسّر اور فقیہہ تھے بلکہ عربی اور فارسی کے قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ فارسی شاعری میں ان کی کئی ضخیم کتابیں ہیں۔ ڈاکٹر ظہور الدین احمد نے ان کے شاعرانہ کمالات پر چالیس صفحات وقف کئے ہیں۔ مُلّا عبد القادر بدیوانی جیسے عالم اور نقّاد نے ان کی شعری صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے مشہور تاریخ میں اِن کا نمونۂ کلام نقل کیا ہے۔ فیضی کی تفسیر پر اُنہوں نے ۴۶ اشعار میں تقریظ لکھی ہے جس میں تعریف سے زیادہ تفسیر بالرّائے کی وعید کی طرف اِشارۃً توجہ دلائی ہے۔ اِس کے باوجود فیضی نے پوری فراخدلی سے اِس تقریظ کو اپنی تفسیر کے آخر میں شامِل کیا ہے۔ ہم اِس سے چند اشعار نمونۃً درج کرتے ہیں:۔

یا مَنْ بسرّ الوحیِ انت اعْلَمْ، قد جاءنا مِنك الکتاب المحکم

یا مَنْ بفیضٍ کاملٍ خصصتَ من علّمت مالم یکن ھُوَ یعلم

اھل الھدیٰ وھم اھتدوا الّا بہٖ ما ضلّ اِلّا ظالمٌ بل اظلم

من فسر القرآن لا عن رابہٖ عبدٌ عظیم شانہٗ بل اعظم[2]

(اے نبیؐ! آپؐ ہی وحی کے راز سے سب سے زیادہ واقف ہیں۔ آپؐ ہی کے ذریعہ یہ مُحکم کتاب (قرآنِ پاک) ہم تک پہنچی۔ کامل فیوض و—

---

[1] پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ: جلد اوّل "صرفی"۔ [2] سواطع الالہام۔ ۷۳۹

برکات کے لئے صرف آپؐ کی مقدس ذات مخصوص کی گئی اور آپؐ کو وہ علم سکھایا گیا جس کا جاننا آپؐ کے سوا دوسرے کے لئے محال تھا۔ ہدایت مندوں نے صرف اسی پاک کتاب کی بدولت ہدایت پائی تھی۔ اگر کوئی گمراہ ہوا تو وہی ہوا جس نے قرآن پر زیادتی کی ہے اور وہی شخص سب سے بڑا ظالم ہے۔ رہا وہ بندہ، جس نے قرآنِ پاک کی تفسیر اپنی رائے کے تابع بنا کر نہیں کی وہ بڑی شان کا مالک ہے۔"

صرفیؒ کی بہت سی غزلیں ایسی ہیں کہ جن کا ایک مصرع عربی اور دوسرا فارسی میں ہے وہ اُن کی قادر الکلامی اور برجستہ گوئی پر روشنی ڈالتی ہیں۔ بدیوانی نے اسی نوع کی ایک غزلیہ نظم اپنی کتاب میں نقل کی ہے اور وہ یہ ہے :-

در دمی کہ ایں نالہ می کردم رقم — کانَ یجری الدمعُ ممزوجاً بدم
ہر رقم کز خامہ ام ظاہر شُدی — کاد یمحو معنی ذالک الرقم
محو حرفِ اشتیاق از لوحِ دل — لیسَ فی وُسعی وقد جفّ القلم
در بلائے ہجر حکمت ہا بود — لیتنی کوشفتُ عن تلک الحِکم
صرفی از دریائے اشکم نہ محیط — لیسَ الّا مثل رشفٍ مِن دِیَم[1]

(جس حال میں، میں یہ آہ و فغاں قیدِ تحریر میں لا رہا ہوں، آنسو میرے خون سے مل کر بہ رہے ہیں۔ ہر وہ بات جو میرے قلم سے ظاہر ہو رہی ہے، قریب ہے کہ اس کا مغز و معنیٰ ہی مٹ جائے۔ شوق کا حرف ہی اب دِل سے مٹ گیا، کیونکہ اس کے لئے جو حوصلہ مطلوب تھا وہ مجھ میں نہیں رہا۔ یہاں تک کہ اب قلم بھی خشک ہوگیا۔ جدائی کی

---

[1] منتخب التواریخ۔ ج ۳، ص ۱۲۸

آزمائش میں بہت سی حکمتیں ہوتی ہیں۔ کاش یہ حکمتیں اب مجھ پر کھل جائیں۔ اے صرفی تم نے جو دریا سے (نہ کہ سمندر سے) اِتنا آنسو بہایا، اِسکی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اِس کی مِثال بارش کے قطرے کی ہے)۔

شیخ صرفی نے فارسی کے نامور شعراء کی چیدہ چیدہ غزلوں کی اتباع میں غزلیں کہی ہیں۔ تتبعؔ کی یہ کوشش ان غزلوں میں کامیاب نظر آتی ہے جو تغزل اور غنائی شان میں آج بھی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔ خواجہ حافظ شیرازی کی مشہور غزل جس کا مطلع یہ ہے:-

الا یا ایھا الساقی اَدِر کاساً و ناوِلہا
کہ عشق آسان نمود اوّل ولے اُفتاد مُشکلہا

کے طرز پر مستقل غزل لکھی ہے، جس کا مطلع یہ ہے:-

حَبِیبِی ضَربۃً بالسیف تکفِینی تعجلّھا
کہ در تاخیرِ آفات است و در آفات مشکلہا

اِسی طرح مولانا جامیؒ کی ایک مشہور غزل، جو اِس مطلع سے شروع ہوتی ہے:-

اَحِنّ شوقاً اِلیٰ دِیارٍ لقیتُ فیہا جمال سلمیٰ
کہ می رساند از آں نواحی نوید لطفِ بجانب ما

کی پیروی میں حسبِ ذیل غزل کہی ہے:-

حُبِیتُ حُبّاً سُلِبتُ عقلاً غُلِبتُ شوقاً بِوَصلِ سلمیٰ[1]
کہ میتواند خبر رساند آں پری وش زِ حالت ما

---

[1] منتخب التواریخ: ج ۳ ص ۱۲۸

چہ گویم احوالِ خود عزیزاں کہ خوار زارم بکنجِ حرماں!
مُلِئتُ حزناً حزنتُ هجراً هجرتُ ممّن سعیٰ الینا

حکیت من تا کجا بنالم بنیست چوں من کسے بعالم
سقیمُ هجرٍ عدیمُ صبرٍ کثیرُ بلویٰ قلیل شکویٰ

سلبتَ عقلی نهبتَ قلبی فانتَ حلّی وانتَ حبّی
بخوب رویانِ دیگر اکنون چکار دارم تو خود بفرما

زِ عشق زاہد کنارہ گیرد دلِ من آنجا بجاں بزیرد
فمثل سمّ علیہ مُرٌّ مثلُ رُمّان علیٰ احلیٰ

حسرت دموعی علیٰ خدودی فهذه بالهویٰ شهودی
گواہِ عالم ببین و رحمے بحالِ ایں دلِ شکستہ فرما

بسے چو صرفی بکنجِ حرماں قتیلِ شوق و مریضِ حرمان
فبالوصالِ حیوٰةُ قتلیٰ وبالّلقاءِ شفاءُ مرضیٰ

(مجھے محبت دی گئی اور عقل چھین لی گئی۔ سلمیٰ کی ملاقات کا شوق مجھے دامنگیر ہوا، اب کون ہے جو اس حسین و جمیل محبوبہ کو ہماری حالت سے

باخبر کرے۔ دوستو! میں اپنا حال کیسے بیان کروں؛ بس یوں سمجھو کہ میں ناامیدی کے ایک گوشے میں پڑا ہوں۔ مجھے غم و اندوہ سے بھر دیا گیا کیونکہ مجھے اس دوست سے دور رکھا گیا جو ہماری طرف دوڑا پڑا تھا۔ میں کب تک آہ و فغاں کروں۔ دنیا میں میرا جیسا عاشق اب دوسرا کوئی نہیں ہوگا جو جُدائی سے بیمار، صبر سے محروم، آزمائشوں سے گھرا ہوا اور گلہ و شکوہ کم کرنے والا ہو۔ اے محبوب! تو نے اپنے حسن و جمال سے میری عقل سلب کی، میرے لاپرواہ دِل کو بیدار کیا۔ اب تو ہی میری آرزو اور تو ہی میرا ہمنشین ہے۔ تو ہی بتا کہ اب مجھے دوسرے حسینوں سے کیا سروکار رہا جو تمہیں چھوڑ کر ان کی طرف مائل ہو جاؤں! زاہد نے عشق سے مُنہ موڑا جبکہ میرا دِل اس پر جان دینا چاہتا ہے۔ اِس طرح جو چیز زاہد کے لئے زہر کے مانند کڑوی ہے، وہ میرے لئے انار کی مٹھاس رکھتی ہے۔ میرا آنسو میرے رخساروں پر گرا تو گویا وہی میرے عشق پر گواہ رہا۔ تو اے میرے دِل کے مالک! تو ہی میرا حال مشاہدہ فرما، اور میرے دل کی شکستگی پر رحم کھا۔ صرفی تو اس راہ میں تنہا نہیں ہے۔ تمہارے ہی مانند اور بھی بہت سے لوگ ہیں جو کنجِ تنہائی میں پڑے ہیں۔ ناامیدی نے انہیں بیمار اور غلبۂ شوق نے ہلاکت میں جھونک دیا ہے، مگر یاد رکھو، ایسے مقتولانِ عشق کی زندگی محبوب کے وصال میں موجود ہے اور ایسے بیماروں کی شفا اس کی ملاقات میں پوشیدہ ہے۔"

حضرت صرفی کا عربی کلام ان کے فارسی کلام میں منتشر ہے جس کا ایک بڑا حصہ طبع بھی ہو چکا ہے۔

حُبّی | شیخ حبیب اللہ نوشہری ؒ کشمیر کے بلند مرتبہ صوفی تھے جو اکثر وقت سرود و سروز کی کیفیت میں غرق رہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جہانگیر بادشاہ ان کی ملاقات کو آیا تو شیخ کو اسی کیفیت میں مست و مگن پایا، ان کی ولادت ۹۶۳ھ کو نوشہرہ میں ہوئی۔ والدِ بزرگوار ممتاز تاجر تھے۔ شیخ حبیب اللہ نے بھی ابتداء میں یہی پیشہ اختیار کیا۔ دکان پر دِن بھر قرآنِ پاک کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ اِسی دوران طلبِ علم کا شوق دامنگیر ہوا اور اِس مقصد کے لئے نامور عالِم اور بزرگ مُلّا حسین آفاقی کی طرف رجوع کیا[۱]۔ یہاں سے سلوک و تربیت کی غرض سے میر محمد خلیفہ کی خدمت میں آئے، تاہم حضرتِ شیخ یعقوبِ صرفی ؒ کی صحبت اور روحانی تربیت نے اِن کی زندگی کا رُخ ہی بدل دیا، خاص طور پر یہ انہی کی صحبت کا اثر تھا کہ حضرتِ شیخ نوشہری ؒ ایک دوکاندار صوفی کے بجائے ربانی شاعر اور عالم بن گئے۔ اگرچہ آخری دم تک اِستغراقی کیفیت غالِب رہی مگر شریعت کی پاسداری، احکام و عبادات پر مُداوَمت اور اصلاحِ معاشرہ کی منصبی ذمہ داری کا خیال کبھی آنکھوں سے اوجھل نہ رہا۔ ۶۳ سال کی عمر میں مطابق ۱۰۲۶ھ داعی اجل کو لبیک کہا[۲]۔ اُن کا مزار آج بھی ان کے ہزاروں عقیدتمندوں کے لئے متبرک ہے۔

شیخ حبیب اللہ نوشہری ؒ صاحبِ تصانیف بزرگ تھے۔ دیوانِ حُبّی، تنبیہ القلوب، وصیّت نامہ صرفیؒ، مراۃ القلوب، مقامات حضرتِ ایشاں (شیخ یعقوبِ صرفی) وغیرہ ان کی منظوم فارسی کتابیں ہیں۔ عربی میں جو کچھ نظم کیا ہے۔ وہ انہی کتابوں میں مُنتشر ہے۔ عربی نثر میں ایک رسالہ "رسالۃ السلوک" کے

---

[۱] فتحاتِ کبرویہ (قلمی) : تالیف : شیخ عبدالوہاب نوری

[۲] خزینۃ الاصفیاء : مولانا غلام سرور لاہوری ص ۳۴۳ ج ۲

نام سے یادگار ہے۔ جس کا ذکر اس کتاب کے چوتھے حصے میں آئے گا (انشاء اللہ)۔

حبّی بلاشبہ فارسی زبان ہی کے برگزیدہ شاعر تھے، تاہم عربی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ عربی میں ان کی وہ مثنوی کشمیر میں مشہور ہوئی جو "الانصاف فی بیان طریقۃ النجاۃ" سے موسوم ہے۔ بظاہر یہ مثنوی کسی فنّی اور ادبی خوبی سے عاری ہے مگر چونکہ حضرت حبّی نے اسے ایک مستقل نظم کی صورت میں ترتیب دیا ہے جس سے اسے خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ اُستادِ محترم ڈاکٹر حامد علی خان صاحب نے لکھا ہے کہ "ہندوستان میں غالباً یہ پہلی عربی مثنوی ہے[1]"۔ کشمیر میں یہ پہلے ہی طبع ہو چکی ہے اس کے علاوہ مختلف کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے بھی موجود ہیں۔

اس مثنوی میں عشق و محبّت کی کیفیت بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور سلاسلِ تصوّف میں سلسلۂ کبرویّہ کے ممیّزات اور کچھ نامور مشائخ کبرویّہ کے کمالات اُجاگر کئے گئے ہیں۔ کشمیر میں حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ اس سلسلے کے مبلّغِ اوّل تھے، مثنوی میں ان کا ذکرِ خیر خصوصیت سے کیا گیا ہے۔ یہاں چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں:۔

مذهب العشق مذهب واحد	إذهب إذهب عليه يا زاهد
ليس للعقل اجتهاد فيه	ليس للنقل اعتماد فيه
إنّما الحال ههنا منظور	إنّما القال ههنا مهجور
دولة العشق دولة الكبرىٰ	حصل الكبروي من الكبرىٰ

---

[1] ہندوستان میں عربی شعر و شاعری (غیر مطبوعہ)۔

بنتجی القضیۃ من الکبریٰ لا تجئ ھذہ من الصغریٰ
الطریق الھدیٰ طریقتنا یتجلی بہ حقیقتنا

کیف لا کیف لا کذا و کذا والأمیر الکبیر دا خلھا
ذاتہٗ کان مثل ذات ابیہ صفتہ الابن بالصفات شبیہ
ظاھراً کان اعلم العلماء باطناً کان اعرف العرفاء

"عشق کا صرف ایک ہی مذہب ہوتا ہے، اے زاہد خشک، یہ تمہاری سمجھ سے بلند ہے۔ اس لئے تم اس سے دور ہی رہو۔ اس میں عقل کو ورزش دکھانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے اور نہ اس میں نقل پر ہی زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جس میں حال اور جذبے کو قبول کیا جاتا ہے۔ عقلی بحثوں سے اس میں دامن بچایا جاتا ہے۔ عشق کا سرمایہ سب سے بڑا سرمایہ ہوتا ہے۔ سلسلۂ کبرویہ سے تعلق رکھنے والوں نے اسے اس کے راہنما شیخ نجم الدین کُبریٰ سے حاصل کیا ہے۔ یہ وہ منطق ہے جسے حضرت شیخؒ ہی کے افادات کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے، علمِ منطق کی خشک بحثوں سے نہیں۔ راست روی ہمارا شیوہ ہے۔ اسی سے ہماری حقیقت ہُویدا ہو جاتی ہے۔ آخر ایسا کیوں نہیں ہو سکتا جبکہ اس راہ کے ایک بڑے علمبردار میر سیّد علی ہمدانیؒ بھی اس میں شامل ہیں۔ حضرت امیر کبیرؒ کی ذات اپنے باپ کے مثل ہے۔ بیشک ایک صالح بیٹا اپنے بزرگ باپ کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے (یہاں باپ سے مراد حضرت سیدنا علی بن ابی طالبؓ ہیں۔ میر سیّد علی ہمدانیؒ ایک طرف نجیب الطرفین سیّد تھے۔ دوسری جانب سلسلۂ کبرویہ بھی بالآخر حضرت علیؓ کی مقدس ذات میں

ضم ہو جاتا ہے۔ اس طرح شیخ ہمدانیؒ آپ کی اولاد میں ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کا مشن آگے بڑھانے کے لحاظ سے بھی آپ کے سچے وارث اور جانشین تھے) حضرت امیر کبیرؒ کی ذاتِ طاہرہ میں ایک سرکردہ عالم کی ذات تھی جبکہ وہ باطن میں بہت بڑے عارف باللہ بھی تھے)۔

شیخ حبیب اللہ صاحبؒ نے عربی میں مستقل غزلیں بھی لکھی ہیں۔ جن کا مزاج فارسی غزلیات کا چربہ ہے اور اصل عربی شاعری سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ ہم نمونے کے طور پر ایک عشقیہ نظم نقل کرتے ہیں، اس کا مقطع فارسی میں ہے:۔

حبیبی الیکَ حشائیُ مشی
فاین المرام وأین الحشا

یراک الحشا بالغدو والعشا
فنعم الغدا ونعم العشا

لدیك جنانی لدیّ الهموم
عسیٰ ان یلی مهجتی انِ تشا

تجلّی النهار یصیح الصبح
بوجه الرّقیب اذا غطشا

اردنا المدام بمیلِ تمام
فمن جرعةٍ قلبنا انتشا

فمن لیس فی قلبہ حبك
جدیدٌ بلا مهجتہٖ انفشآ

نیازی زِ حُبّی و نازی ز تو
نیازی و نازی خوشا مہوشا

(میرے محبوب میرا دِل تمہاری جانب چلنے لگا۔ مگر میں نے یہ کیا کہا ؟ کہاں میرا محبوب اور کہاں میرا دل ! میرا دِل صبح و شام تمہیں دیکھنا رہتا ہے ۔ اِس اِنتظار میں میری صبح و شام کس خوبی سے گزرتے ہیں ۔ میرا دِل تمہارے پاس ہے ، جبکہ میرے پاس صرف غم ہے ، امید رکھتا ہوں کہ دِل اپنا مدّعا پاکر ہی رہے گا ، شرط یہ ہے کہ تم چاہو۔ دِن دوبارہ روشن ہوا اور صبح نمودار ہوئی ۔ رقیب کا چہرہ شب کی تاریکی کے بعد ظاہر ہوا۔ ہم نے پوری رغبت کے ساتھ شراب (معرفت) کی خواہش کی مگر ابھی صرف ایک ہی گھونٹ پیا تھا کہ دِل مست ہوا۔ پس جس کے دل میں تمہاری محبّت نہ ہو تو وہ اِس قابل ہے کہ جان دے کر وجود کے پردے سے ہٹ جائے) ۔

شیخ حبیب اللہ صاحبؒ نے بھی فارسی کے بلند پایہ شعراء کی غزلوں کے تتبّع میں طبع آزمائی کی ہے جن کا ایک مصرعہ عربی اور دوسرا فارسی میں ہے ۔

اس میں شک نہیں ہے کہ یہ تقلید کامیاب رہی ہے۔ ہم اس نوع کی ایک غزل پیش کرتے ہیں۔ یہ غزل اُنہوں نے مولانا جامی کی ایک مشہور غزل کی زمین میں کہی ہے۔ مولانا جامی کی غزل کا مطلع یہ ہے:۔

احنّ شوقاً اِلیٰ دیارٍ لقیتُ فیھا دیار سلمیٰ
کہ می رساند از آں نواحی نوید لطف بجانبِ ما

شیخ حبیب اللہ کی غزل یہ ہے:۔

اَردتُ اَخذَ الغزال یوماً فصرتُ صیداً لعین عذرا
کہ می رساند زِ وادیٔ غم، پیامِ محزون بہ خانۂ ما

یکی نباشد چو مَن بعالم، شکستہ حالی بہ نسلِ آدم
جُبِستُ حسباً قُتِلتُ قتلاً غرقتُ غرقاً حُرِقتُ ناراً

ببین کہ سودا کرد جانم مبین کہ سودی دراں ندیدم
شَریتُ غماً بہمّ دُنیا وَ بِعتُ ھماً بغمّ سلمیٰ

اذا ضحکت فصرتُ حیاً فانّہٗ کالزلال شبیاً
از دستِ قائم حیاتِ خضرو از دست دائم دم مسیحا

زہی چہ روزی کہ دیدہ مست رُوشبی چہ دیدہ مست مو
کانّ وجھك معاش جنّی و انّ شعرك لباس ھذا

(میں نے ایک دن ایک ہرن (محبوب) کو پکڑنے کا ارادہ کیا مگر میں خود ہی اس کی نگاہ کا شکار ہوگیا۔ اب کون ہے جو غم عشق کی وادی سے مجھ غمزدہ شخص کا پیغام میرے گھر تک پہنچا دے۔ اس دنیا میں شاید پوری انسانی نسل میں ایسا کوئی نہیں ہوگا جو مجھ جیسا شکستہ حال ہو کیونکہ میں سختی کے ساتھ عشق و محبت کا قیدی بنایا گیا۔ مجھے جان سے مارا گیا، مجھے ڈبو دیا گیا اور مجھے جلا دیا گیا۔ تم صرف یہ دیکھو کہ میں نے کس قسم کا سودا کیا، یہ مت دیکھو کہ مجھے اس میں کچھ فائدہ بھی ہوا یا نہیں۔ میں نے دنیا کے غم میں غم خریدا پھر اسے سلمیٰ کی محبت کے غم میں فروخت کیا۔ مجھے تیرِ عشق مارا گیا۔ میرا گوشت بُھنا گیا۔ یہ صرف تیری وجہ سے ہوا تاہم میری دُعا ہے کہ خدا تمہیں معاف کرے اور جزائے خیر عطا کرے۔ اگر تم اپنے تبسّم سے مجھ پر نمک پاشی نہ کرو گے تو مجھ پر افسوس! یعنی تمہارے ستانے میں مجھے لطف آتا ہے۔ تمہارے تبسّم میں میری زندگی ہے۔ یہ میرے لئے آبِ زلال کے مانند ہے کیونکہ اسی سے حضرت خضرؑ کی زندگی بھی قائم ہے اور اسی پر حضرتِ عیسیٰؑ کے معجزات کا مدار ہے وہ دن کس قدر خوش نصیبی کا دن تھا جس میں، میں نے تمہیں دیکھا اور وہ رات کتنی خوب رہی جس میں تمہارے گیسو مشاہدہ کئے گویا تمہارا چہرہ عاشق کی زندگی اور تمہاری زلفیں اس کا لباس بن گئے)۔

حضرت شیخؒ کی جملہ تصانیف ریاستِ جموں و کشمیر کی ریسرچ لائبریری میں

موجود ہیں۔ یہ ساری کتابیں ۲۱ (A) تا ۲۱ (E) اور ۱۶۳۳ تا ۱۶۴۶ نمبرات کے تحت دیکھی جاسکتی ہیں۔ مؤلف نے انہیں سے استفادہ کیا ہے۔

مُلّا نازک اخوند مُلّا نازک گیارھویں صدی ہجری کے نامور عالم اور بزرگ تھے۔ محلہ تاشوان سرینگر میں ان کی ولادت ہوئی اور یہیں ۱۰۹۷ھ میں وفات پائی۔ عقلی اور نقلی علوم سے استفادہ کیا ہے۔ حاجی محمد صاحب سیالکوٹ سے کشمیر وارد ہوئے تو مُلّا صاحب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور روحانی فیض حاصل کیا۔ زندگی کے وسطی دور میں اِن پر فنائیت چھاگئی اور وہ صاحبِ کشف و کرامات ہوئے۔ اچانک ان کا فرزند مُلّا محمد باقر دُنیا سے چل بسا۔ عالم اور جواں عمر فرزند کی موت اُن کے قلب و دماغ پر غم کا پہاڑ بن کر نازل ہوئی۔ تاہم صبر و ضبط کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہ دیا۔ صلحاء اور اصحابِ علم سے ان کی مجلس بھری رہتی تھی، یہاں مختلف علمی اور روحانی مسائل و رموز پر تبادلۂ خیالات ہوتا تھا۔ اُنہوں نے احباب اور عقیدتمندوں کی ایک بڑی جماعت اپنے پیچھے چھوڑ دی، جنہوں نے ان کے اِنتقال کے بعد ان کی قبر پر گنبد تعمیر کیا۔ ان کی آخری خواب گاہ سیّد محمد منطقی کے مزار کے متصل ہے[۱]

مُلّا صاحب فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں کبھی کبھار شعر کہتے تھے جن کے مرکزی مضامین عشقِ اِلٰہی، مناجات اور نعت ہیں۔ عربی میں اُن کی صرف دو مختصر نظمیں ملتی ہیں، جو یہ ہیں:۔

قد رأینا الیوم أنوار الحبیب — لا تکن فیما شھدنا من مُریب
نحن نشرب دائماً خمر الودود — لیس للزھاد من ھذا نصیب
نحن ندعوا حاضراً فی حضرتك — یا دلیل الحائرین ربّ المجیب

---

[۱] تاریخ اعظمی: ص ۱۸۱

مات فی بیتك غریب نازکی یا رحیم ارحم لِاحوال الغریب

(آج ہم نے اپنے محبوب کے انوار مشاہدہ کئے۔ سو اس میں تمہیں کسی شبہ میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ ہم اپنے شفیق محبوب کی شراب پیتے رہتے ہیں، خشک زاہدوں کے لئے اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ ہم تمہارے حضور ہر وقت ہاتھ پھیلائے مانگتے ہیں۔ سوائے حیران اور سرگرداں عاشقوں کے راہنما، ہم تم ہی سے قبولیت کی اُمید رکھتے ہیں۔ نازکی غریب صرف تیرے در پر مرگیا، اے رحیم، اب تو ہی اس کے احوال پر رحم فرما۔)

دوسری نظم پانچ اشعار پر مشتمل ہے، اس کی نوعیت مناجات کی ہے۔

انتَ مطلوبٌ وموجودٌ لنا انتَ معبودٌ و مقصودٌ لنا

لا نریٰ فی الکونِ الّا وجھك انتَ مشھودٌ و موجودٌ لنا

مذھب الزھاد منعوت لھم مشرَب العُشّاقِ محمودٌ لنا

اِن وعدتم باللقا فی الآخرۃ وھو فی الکونین مشھودٌ لنا

لا زوالٌ عارضٌ للعارفین
نازکی الظلّ ممدودٌ لنا

(تو ہی ہمارا مقصود و مطلوب ہے۔ دنیا میں ہم تمہارا وجود مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس طرح ہماری نگاہوں کا مرکز صرف تیری ذات ہے۔ زاہدوں کا راستہ ان کے لئے قابلِ تعریف ہے جبکہ عاشقوں کا مسلک ان کے لئے پسندیدہ ہے۔ اگر تو نے آخرت میں ملاقات بخشنے کا وعدہ کیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ تو ہر دم ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اے نازکی، عرفاء کو زوال لاحق نہیں ہوتا ہے۔ اللہ کا سایہ ہم پر پھیلا ہوا ہے)۔

وجودی افکار و خیالات کو شعراءِ کشمیر نے جگہ جگہ مزّہ لے لے کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور وحدۃ الوجود ہر دور اور ہر زبان کے شاعر کا مشترک موضوع رہا ہے۔ مذکورالصدر نظموں میں بھی شاعر نے اسی کو فخر سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم ہمیں اعتراف ہے کہ دونوں نظمیں ادبی اور معنوی دونوں اعتبار سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی ہیں۔ غریب، منظور اور زوالِ عارض کو بڑی مشکل سے عربی میں اُن معانی میں اِستعمال کیا جاتا ہے جو شاعر کے پیشِ نظر رہے ہیں۔ احقر نے اپنے ترجمے میں شاعر کے ما فی الضمیر کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

مُلّا طیّب آپ مُلّا نازک کے معاصر اور شیخِ طریقت ابوالفقراء نصیب الدین غازی، (م۔ ۱۰۴۷ھ) کے مریدوں میں سے تھے۔ تاریخِ ولادت پردۂ اخفا میں ہے جبکہ تاریخِ وفات ۱۴ر ذوالحجہ ۱۰۸۶ھ بتائی جاتی ہے۔[1]

مُلّا طیّب صوفی منش بزرگ تھے۔ پہلے علمی زندگی اختیار کی تھی مگر فوراً اِس سے دست بردار ہو کر صوفیانہ راستہ اختیار کیا۔ طریقت میں سلسلۂ نقشبندیہ سے منسلک ہوئے۔ آخری عمر میں جذب و دیوانگی چھا گئی جس سے تمام تکالیفِ شرعیہ سے خلاصی پائی۔ طبیعت موزوں تھی۔ عربی اور فارسی میں عشقیہ نظمیں کہتے تھے۔ تخلّص طیّب رکھتے تھے۔ احقر کو ان کی ایک ہی نظم دستیاب ہو سکی جو مُلّا نازک کی مذکورہ بالا نظموں کے ساتھ بڑی مماثلت رکھتی ہے۔

لقد مسّنی الضرُّ ضرٌّ عجیبٌ
مریضٌ سقیمٌ فاین الطبیب
ذلولٌ ملولٌ نحیفٌ ضعیف
فقیرٌ حقیرٌ ذلیلٌ غریب

---

[1] تاریخ حسن ج ۳

الا فادفع عنّی کلّ ھمّ وغمّ
الا إنّ ربّی قریبٌ مجیب
الٰھی غفورٌ شکورٌ ودود
رئوفٌ رحیمٌ حفیظٌ رقیب
أجِب دعوتی اختفر حوبتی
اطبنی بعیشٍ رضیٍّ رحیب
رکبتُ الخطایا وذنبی عظیم
وأرجوک إدخال دار المنیب
اگر فعلِ طبیبّ ہمیں است لیک
ففولٌ لہٗ طبیبٌ مُستطیب [1]

(بیشک مجھے عجیب وغریب بیماری لاحق ہوئی ہے۔ میں بیمار ہوں، پس میرا طبیب کہاں ہے؟ میں نڈھال، پریشاں حال، ناتواں اور نحیف ہوں۔ میں محتاج، مفلس، گرا ہوا اور بے بس ہوں۔ اے خدا میری پریشانی اور پراگندگی دور فرما۔ میں اپنے خدا سے پُر امید ہوں کیونکہ وہ میرے قریب ہے اور میری دعا قبول کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اے اللہ! تو بخشنے والا، شکر کا حقدار اور بندوں پر شفقت کرنے والا ہے تو رؤف، رحیم، محافظ اور نگہبان ہے۔ اے خدا، میری دعا قبول فرما۔ میرے گناہوں کو قابلِ درگزر سمجھ۔ مجھے بھی اچھی زندگی اور کشادگی سے نواز۔ میں نے بہت سی خطاکاریاں کی ہیں اور بڑے گناہ کا مرتکب ہوا ہوں۔ میں اِنابت کے مقام پر جگہ دلانے کی تجھ ہی سے امید رکھتا ہوں۔

---

[1] تاریخ حسن جلد ۳

اگر طبیب کے اعمال ایسے ہی ہیں (جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا) مگر اس کی باتیں میٹھی اور خوش کن ہیں۔)

مولانا صدرالدین خان آزردہ ہم نے مولانا کی حیات فنِ حدیث اور علمِ فقہ میں ان کے درک و کمال اور تحریری یادگاریں اس کتاب کے حصۂ اوّل میں کچھ روشنی ڈالی ہے۔ یہاں عربی شعر و ادب پر ان کے مقام و مرتبہ پر اظہارِ خیال کیا جاتا ہے۔

مولانا آزردہ عربیت کے ماہر اور فنونِ ادبیہ کے متبحر عالم تھے[۱] وہ نہ صرف فقہی مسائل پر رائے زنی کرتے تھے بلکہ صرفی و نحوی مباحث کا محققانہ جواب بھی دیا کرتے تھے۔ ایک نحوی مسئلے کا استفتا اور فتویٰ، جو دونوں عربی میں ہیں، پروفیسر مولوی محمد شفیع صاحب (سابق ایڈیٹر اورنٹل کالج لاہور) کو دستیاب ہوا تھا جس کا عکس انہوں نے مولانا کی مختصر سوانح کے ساتھ شائع کیا ہے۔

مفتی صاحب مرحوم تینوں زبانوں یعنی عربی، فارسی اور اردو میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ غالب جیسا استادِ زمانہ اپنے قصائد اور غزلوں کی داد ان سے حاصل کرنے میں آرزومند رہتا تھا اور "مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست" کہہ کر معاصرانہ چشمک سے بلند رہنے کی درخواست کرتا تھا[۲] نواب صدیق حسین خان مرحوم (جو ان کے مشہور شاگردوں میں سے تھے) لکھتے ہیں کہ "ان کی مجلس میں طلبۂ علم اور اہلِ دنیا کے علاوہ شعراء، ادباء اور انشا پرداز بھی استفادے کے لئے آیا کرتے تھے"[۳] مولانا صدرالدین اور ان کے مشہور رفیق درس علامہ فضلِ حق خیرآبادی

---

[۱] "نزہۃ الخواطر و بہجۃ المسامع والنواظر ج ۷، ص ۲۲۰ — ۲۲۱

[۲] کلیاتِ غالب (فارسی)، لاہور ۱۹۶۵ء ص: ۷۵

[۳] اتحاف النبلاء: نواب صدیق حسن خان: ص ۴۳

دونوں شعر و شاعری میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے اصلاح لیتے تھے[۱] یہاں تک کہ شعر گوئی میں سربرآوردہ شعراء کی صف میں شامل ہوئے مؤلف شمع انجمن لکھتے ہیں :-

در فنونِ ادبیہ ثانیِ اعشیٰ و جریر است[۲]

جس طرح مفتی صاحب کے اکثر و بیشتر رسائل و فتاویٰ ضائع ہو گئے ہیں، اسی طرح ان کا منظوم کلام بھی تلف ہوا ہے۔ اب اِن کے چند گنے چنے اشعار ہی ملتے ہیں، جنہیں ان کے تذکرہ نگاروں نے نمونۂ کلام کے طور پر محفوظ کیا ہے۔ مصنّف فوائد الدھر نے سات اشعار اور صاحب المعتقد المنتقد نے دو شعر درج کئے ہیں[۳] سر سید احمد خان اور مولانا عبدالحی حسنی نے پانچ اشعار درج کئے ہیں اور وہ یہ ہیں :-

وکُنّا کغُصنَنی بانۃٍ قد تأنّقا
علیٰ دوحۃٍ حتّیٰ اسطالا وأینعا
بینهما صدحُ الحمام مُرَجّعاً
ویسقیهما کأسُ السّحائبِ مترعا
سلیمین مِن خطب الزّمان اذا سعٰی
خلیین مِن قول الحسود اذا سعا
ففارقنی عن غیر ذنبٍ جنیتہ
والقیٰ بقلبی حرقۃ و توجّعا[۴]

---

۱ اتحاف النبلاء : نواب صدیق حسن خان : ص: ۳۳۴ ۲ حسن العزیز : مولانا اشرف علی تھانوی : ج ۴ ص ۱۹۵ ۳ تذکرہ شعرائے کشمیر : سید حسام الدین راشدی ج ۱ ص ۸۰ ۴ ہندوستان میں عربی شاعری (غیر مطبوعہ) : ڈاکٹر حامد علی خان صاحب (علیگڈھ) ۵ "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند : ص ۴۸، دمشق ۱۹۵۸ء

عفی اللہ عنہ ما جناہ فانیؔ
حفظت لہٗ العہد القدیم وضیعاؔ[1]

(ہم دو درختِ بان کی دو ٹہنیوں کے مانند تھے جو ایک دوسرے کی محبت میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ ایک ساتھ بلند ہوئے تھے اور پک گئے تھے۔ اِن دو ٹہنیوں کو کبوتر کی سریلی آواز بار بار گنگناتی تھی اور بادلوں کے جام انہیں بھرپور سیراب کرتے تھے۔ زمانے کا جب بھی کوئی حادثہ حملہ آور ہوتا تھا تو یہ ٹہنیاں محفوظ رہتی تھیں اور جب بھی کوئی حاسد چغلی کھانے کی کوشش کرتا تھا تو اس سے بے اثر رہتی تھیں پھر وہ بغیر کسی جرم و خطا کے مجھ سے جدا ہوا۔ اور میرے دِل میں آگ لگادی اور گہرے درد میں مبتلا کیا۔ اللہ اُسے اُس کی خطا معاف کرے میں نے اِس کے عہد و پیمان کی حفاظت کی اگرچہ اس نے اسے ضائع کر دیا)۔

شیخ احمد واعظ اِس کتاب میں مختلف مقامات پر شیخ احمد کے علم و فضل اور خدمات و کمالات کا ذکر آیا ہے۔ تصوّف اور علمِ کلام کے ابواب میں تفصیلی حالات پیش کئے جائیں گے۔ آپ کی ولادت "دبا خان" سرینگر میں ہوئی۔ تاریخ ولادت معلوم نہیں ہو سکی جبکہ اِنتقال اسی محلے میں ۶ محرم ۱۲۹۲ھ کو کیا۔ عربی علوم کی تحصیل مولانا نورالدین منتوؔ جیسے اکابر علماء سے کی۔ اِس کے بعد دلّی گئے وہاں حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب محدثؒ کے مشہورِ عام درسِ حدیث میں داخل ہوئے۔ تاہم اساتذہ کی تربیت سے زیادہ خود اپنی مشقت اور ذوقِ جستجو سے مختلف فنون میں مہارت حاصل کی۔ مشہور ہے کہ ہزاروں احادیثِ مبارکہ

[1] الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند : ص ۸۴، دمشق ۱۹۵۸ء
[2] تاریخ حسن : ج ۳ ص ۳۹۴

کے حافظ تھے۔ فقہ و حدیث کے ساتھ خاص مناسبت رکھتے تھے۔ عربی اور فارسی میں بیسیوں کتابیں لکھی ہیں جن میں اب بیشتر دست و بردِ زمانہ کی نذر ہوئی ہیں۔ جو کتابیں موجود ہیں ان میں حدیث میں "عین الجاری فی شرح اربعین القاری" فقہ میں "انفع الوسائل فی جواب خمسۃ مسائل" اور عقائد و علمِ کلام میں "نجوم الشہابیۃ رجوم للوھابیۃ" اور "تنبیہ الغافلین" قابلِ ذکر ہیں۔

شیخ احمد واعظ فارسی اور عربی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ شعر کا موضوع زیادہ تر نعت اور صوفیانہ مسائل ہیں۔ وہ شاعر سے زیادہ عالم اور محقق تھے۔ اسی وجہ سے اُن کے منظوم کلام میں جذبے کے بجائے معلومات کا غلبہ ہے۔

حضرتبل سری نگر کا ایک تاریخی مذہبی مقام ہے جہاں پیغمبرِ اسلام ؐ کے موئے مقدس کی زیارت کی جاتی ہے۔ یہ مقدس و محترم تحفہ ایک غیبی اشارہ پر ایک تاجر کے توسط سے پہلے دکن سے دہلی اور آگے کشمیر پہنچا تھا۔ اس کے استقبال کے لئے پوری وادی اُمڈ آئی تھی۔ اکابر علماؒ، مشائخِ وقت اور اربابِ حکومت شوق و محبت سے سرشار برہنہ پا ہو کر سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ یہ بلاشبہ تاریخِ کشمیر کا ایک عظیم الشان واقعہ تھا۔ گو یہ واقعہ حضرت شیخ احمد واعظ کی ولادت سے کئی سال پہلے رونما ہوا تھا مگر اس کے ورودِ مسعود کا اثر ابھی حضرتِ شیخ کے عہد میں بھی تازہ تھا۔ چنانچہ اس کی تازگی کے ہی زیرِ اثر اُنہوں نے عربی میں ایک طویل مخمس نظم کیا جو ۳۴ بندوں پر مشتمل ہے۔ اگر حضرت شیخ طبعی شاعر ہوتے تو اس مخمس کی شان اپنی اثر آفرینی کے لحاظ سے کچھ اور ہوتی۔ اس کے برعکس اس پر صرف علمی مباحث چھائے ہوئے ہیں اور مختلف فقہی اور کلامی مسائل اُبھار کر آثارِ مقدسہ کی زیارت کا جواز

ثابت کیا ہے۔ پہلا بند یہ ہے :۔

قد بدت شمس النبوّۃ ضحو الآثار الشریف

قد حلی الاعجاز حقاً نحو الآثار الشریف

یا سُکاری الحُبّ رُوموا ضحو الآثار الشریف

بالبدنِ والرّوح سیروا نحو الآثار الشریف

ایّھا العشاق سیروا نحو الآثار الشریف

" آثار شریف (موئے پاک کی تشریف آوری کے بعد حضرت بل کا ایک اور نام آثارِ شریف پڑگیا) میں آفتابِ نبوّت طلوع ہوا ہے۔ یہاں صحیح معنوں میں معجزہ دیکھا جاسکتا ہے۔ اے محبّت کے متوالو! آثارِ شریف کی طرف دِل و جان اور ہوش و حواس کو ضبط میں رکھ کر چلو۔ اے عاشقوں کی جماعت! تم بھی آثارِ شریف کی طرف چلو۔"

غرض اس لمبے مخمّس میں رسول اللہ ؐ کی عظمت و بزرگی، آپ کے آثارِ مقدسہ کی تاریخی اہمیّت، ان کی حفاظت و احترام کی طرف صحابۂ کرام اور متقدّمین کا اہتمام ان کے روحانی تصرّفات، احادیث و سیرت نیز کتبِ تاریخ میں ان سے متعلّق واقعات وغیرہ علمی اور تاریخی موضوعات کو نظم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اب سے تقریباً ساٹھ سال پہلے کشمیر کے ایک ذی علم واعظ اور بزرگ حافظ محمد حسن صاحب (گاڈ یاری) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف منسوب تبرّکاتِ مبارکہ پر ایک مستقل " اربعین " مرتب کر کے شائع کیا جو امرتسر کے

مطبع مجدّدی سے طبع ہوا تھا۔ یہ نہایت عالمانہ اور محققانہ مجموعۂ احادیث ہے جس میں حدیث کی اہم ترین تالیفات جیسے بخاری، مسلم، ابو داؤد، سُنن ترمذی، شفائے قاضی عیاضِ مالکی، ابن حبان لمعات (شرح مشکواۃ) سے مواد اخذ کیا گیا۔ اسی مجموعہ کے آخر پر حضرتِ شیخ احمد واعظ کا مذکور الصدر مخمّس شاملِ اشاعت کیا گیا ہے[۱] مؤلفِ رسالہ شیخ احمد کے شاگردوں میں سے تھے۔

مذکور الصدر مخمّس کے علاوہ شیخ احمد صاحب نے فارسی اور عربی میں طویل نظمیں بھی کہی ہیں، جن میں اکثر و بیشتر ناقدری کا شکار ہو کر تلف ہوئی ہیں۔ خاکسار مؤلف کو اپنے محترم چچا صاحب (مولوی سیّد محمد حسن صاحب مدّ ظلہٗ) کے مجموعہ یادداشت میں شیخ احمد واعظ کی ایک طویل نعت ملی جس میں اشعار کی کل تعداد ۷۲ ہے جن میں ۲۹ عربی اور بقیہ فارسی میں ہیں۔ یہاں ہم چند عربی اشعار پیش کرتے ہیں :-

او لم یکفنا من البرهان
لی مع الله یا رسول الله
قد أبان الاله من مجدك
قول لولاهٗ یا رسول الله
إن نرم ناعتاً لأوصافك
حسبنا الله یا رسول الله

أنت من اعجز الوریٰ کلّه
کنهُ معناهُ یا رسول الله

[۱] چہل حدیث: حافظ محمد حسن گاڑیاری: ص ۱۳ تا ۱۸ مطبع مجدّدی امرتسر

من نعدّی لِعَدّ اِحسانك
کیف أحصاه یارسول الله
۲ ثمّا أنت رحمۃ مهداۃ
نعمۃ الله یارسول الله
لا یخف خائفاً من الأهوال
حسّ نت ملجاهُ یارسول الله

(اے اللہ کے رسول! کیا ہمارے لئے آپ کی یہ حدیث پاک کفایت نہیں کر سکتی جس میں آپ نے اپنے قربِ خداوندی کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ مجھے اللہ کے ساتھ ایسا وقت بھی آتا ہے کہ کوئی نبی مُرسل اور کوئی مقرب فرشتہ بھی اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔ خدا نے آپ کی عظمت و بزرگی خود یہ کہہ کر واضح کی کہ اگر آپ کو دنیا میں پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو کائنات کی تخلیق بھی نہ ہوئی ہوتی۔ اگر ہم آپ کے اوصاف و محامد بیان کرنے کا ارادہ کریں تو صرف خدا کی تائید و امداد ہی سے کر سکتے ہیں۔ آپ کی عظمت و بزرگی سمجھنے سے دنیا قاصر و عاجز ہے۔ کس میں ہمت ہے کہ آپ کے احسانات کو گنے؟ ان کا احاطہ ہمارے لئے کیسے ممکن ہے! بیشک آپ رحمت کے پیغمبرِ ہادی ہیں جو اللہ کی طرف سے ایمان والوں کے لئے نعمت ہے جس کے بھی آپ ملجا و ماویٰ بن گئے۔ اُسے پھر کبھی خطروں کی کوئی پروا نہیں ہے۔")

اِسی نعت کے چند اور تلمیحی اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ ان میں آپؐ کے اِنتقالِ پُر ملال پر صحابۂ کرام کی بے قراری اندوہناکی کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

قال فجعاً علیک بو بکر
و اخلیلا یا رسول اللہ
سل سفاً عمر علی الناعی
قال حاشاہ یا رسول اللہ
صار عثمانُ ساکتا عمّن
جاء ما جاہ یا رسول اللہ
اقعد المرتضیٰ فلم ینهض
عند مثواہٗ یا رسول اللہ
ضجّ و ارتجّ عندک الاصحاب
و انبیاہ یا رسول اللہ
اهل بیت الکرام قد صاحوا
وا صفیاہ یا رسول اللہ

"آپؐ کا انتقال ہوا تو حضرتِ ابو بکرؓ نے درد و غم سے پُکارا: ہائے میرے دوست! جب آپؐ کے انتقال کی خبر سنانے والے نے یہ خبر حضرتِ فاروق اعظمؓ کو سُنائی تو اسے ناقابلِ اعتبار سمجھتے ہوئے اُنہوں نے اس پر تلوار کھینچ لی اور فرمایا: ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ حضرتِ عثمانؓ نے یہ خبر سُنی تو دم بخود رہ گئے۔ حضرت علیؓ آپؐ کے مرقد مبارک کے ساتھ چمٹے رہے۔ آپؐ کے دوسرے اصحاب آپ کے اردگرد بیٹھے اور چیختے پکارتے رہے۔ اہلِ بیت کرام پُکار اُٹھے کہ اے خدا کے برگزیدہ پیغمبر! یہ کیا ہوا؟"

حضرت شیخ کے موجود منظوم کلام میں وہ تضمین بھی شامل ہے جو

انہوں نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی طرف منسوب قصیدۂ خمریہ پر لکھی ہے جو ایک ماہانہ رسالہ میں شائع ہوئی ہے[1] مزید برآں اُستاد محترم ڈاکٹر حامد علی خاں صاحب (ریڈر شعبۂ عربی مُسلم یونیورسٹی علیگڑھ) کو توضیح البیان (شرح فُصُوص الحکم) میں بھی شیخ احمد صاحب کے پندرہ اشعار ملے ہیں[2]

مولانا عبدالرشید شوبیانی۔ ہم نے مولانا عبدالرشید کے حالاتِ زندگی اِس کتاب کے حصّہ اوّل میں بیان کئے ہیں۔ یہاں ان کی شعرگوئی پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ مولانا ممدوح اصلاً عالمِ حدیث تھے تاہم شعر و ادب کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ عربی زبان و ادب میں ان کی وسعتِ نظر کے بارے میں مولانا عبدالحی حسنی نے لکھا ہے:۔

کانَ مِن علمآ المبرزین فی النحو واللّغۃ ... ... کان بارعاً فی المعارفِ الادبیۃ[3]

زبان اور نحو میں ممتاز علماء میں سے تھے اور علوم ادبیہ میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔

مولانا سید صدیق حسن خان بھوپالی مرحوم (جن کے مولانا عبدالرشید صاحب کافی مدت تک علمی معاون تھے) کے انتقال کے بعد ان کی کتاب ظفر اللّاضی شائع کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ ناشروں نے اِس پر مولانا عبدالرشید سے تقریظ لکھوائی جو مولانا نے لکھی۔ اس کی ابتداء حمدیہ اشعار سے کی ہے جو آٹھ ہیں۔ بظاہر ان کا تعلق حمد و ثنا سے ہے مگر ان کی قادر الکلامی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ہم یہاں اِن میں سے پانچ اشعار نقل کرتے ہیں:۔

باسمِ الالٰہِ العالمین أبتدی
وبِسنا نورِ الھُدیٰ أقتدی

---

[1] ماہنامہ "سلطان الاولیاء"، سرینگر ۱۹۸۱ء، مارچ [2] ہندوستان میں عربی شاعری (غیر مطبوعہ)

[3] نزھۃ الخواطر: ج ۷ ص ۲۶۱

سبحانك اللّٰهم لا نحصي الثنا
عليك ما عجز عنه الالسُنا
ثمّ صلواة اللہ والتسليم
علیٰ نبیٍ ھدیہُ قویم
محمّد ماحی الظلام الکفر
عن ساحۃ الدنیا بنور لذّکر[2]
منْ ختم اللہ بہ الرّسالۃ
وطھّر الاٗرض مِن الضلالۃ[1]

"میں خدائے دوجہاں کے نام سے اِبتداء کرتا ہوں اور اِس کے نورِ ہدایت کی روشنی میں اِقتداء کرتا ہوں۔ اے اللہ! تیری ذات بلند اور پاک ہے۔ ہم تمہاری ثنا کا شمار کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ اِس سے ہماری زبانیں عاجز اور قاصر ہیں۔ اللہ کا صلواۃ و سلام اس نبی پر ہو جن کی سیرت ہر حیثیت سے درست ہے۔ یہ نبی محمد کے نام نامی سے موسوم ہیں۔ جنہوں نے سطحِ زمین پر قرآن کے نور سے کفر کی تاریکی مٹا ڈالی۔ اِسی پیغمبر پر خدا نے سلسلۂ نبوت ختم کیا اور زمین کو گمراہی کی آلودگی سے پاک کیا۔"

مولانا عبدالرشید صاحب کے منظوم کلام میں ایک عالمانہ نظم کے چند اشعار درج کرنے کے قابل ہیں جو اصل میں ایک تقریظ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا نے یہ نظم اپنے اُس عالمانہ مقدّمہ کتاب کے آخر میں لکھی ہے جو اُنہوں نے مجدالدین عبدالسلام ابن تیمیہؒ کی کتاب "المنتقیٰ مِن اُحادیث الاحکام" پر نواب صدیق حسن خان کے ایما پر لکھا ہے۔ اِس نظم کی ابتدا،

[1] ظفر اللاضی بما یجب فی قضاء علی القاضی: مطبع صدیقی بھوپال: ص ٦١ ١٢٩٤ھ

قدیم عربی شعری روایات کے اِتباع میں دیارِ محبوب سے کی گئی ہے۔ ؎

حیا الالٰہُ مرابِعَ الجیران
کنّا بہا نلھو مَعَ الفرکان

ونقیل عند ۲ اباطح حصیاتھا
أذرت بدرٍ فی نحور غوان

وسقی ریاضاً عابقاتٍ ۲ تحفت
عرف الجنان بمہجۃٍ الوھان

(اللہ پڑوس کے ٹیلوں کو قائم رکھے جہاں ہم پڑوسیوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ جہاں ہم اُن نشیبی زمینوں میں قیلولہ کیا کرتے تھے جن کے سنگریزے ان ہیروں کے مانند بکھرے ہوئے تھے جو حسین و جمیل عورتوں کے سینوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ خدا ان باغیچوں کو جنّت کے خوشبودار پانی سے سیراب کرے جن پہ عاشق اپنی جانیں تحفہ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔")

المنتقیٰ کے مؤلف مجد الدین عبدالسلام ابن تیمیہؒ کے فضل و کمال کا ذکر کرتے ہوئے مولانا کہتے ہیں:۔

منھم ۲ امامٌ بارعٌ متورّعٌ
جدّ الکرام وصفوۃ الاعیان
میزان عدل فی الحدیث ورکنہ
ناوی الیہ عساکر الفرقان

العالم المتنسّك المتاز فی
فقه الحدیث و درایۃ القرآن
حبراتی من ارض حرّان فیا
اھلاً بمن قد جاء من حرّان

(میرے انہی مقتداؤں میں ایک فاضل اور بزرگ امام ہیں جو بزرگوں کے سربراہ خاندان اور نام ور شخصیتوں میں ممتاز ہیں جو حدیث اور اس کے فن میں عدل کی ترازو کی حیثیت رکھتے ہیں اور قرآن کے خادموں کی پناہ گاہ ہیں۔ جو قرآن فہمی اور حدیث کے تفقّہ میں ممتاز عالم اور پرہیزگار بزرگ ہیں۔ اس متبحّر عالم کا تعلق سرزمین حرّان سے ہے۔ پس میں ہر اس شخص کو خوش آمدید کہتا ہوں جو اس جگہ سے تعلق رکھتا ہے۔)

متأخرین میں جس عالمِ دین نے المنتقی کی شرح لکھ کر شہرتِ عام اور بقائے دوام حاصل کیا وہ علّامہ قاضی شوکانی یمنی ہیں۔ ان کی یہ مبسوط شرح "نیل الاوطار" کے نام سے کئی بار شائع ہو چکی ہے۔ مولانا عبدالرشید نے اپنی نظم میں قاضی صاحب کا بھی ذکرِ خیر کیا ہے:-

وادعوا للمؤلف دائماً و کذا
الشیخ شیوخنا الشوکانی
من أوضح السفر الکریم بشرحہ
متقیّداً بادلۃٍ و بیان
مَن ندّہ، فی جمع اسباب الھدیٰ
مَن مثلہٗ فی عالم الامکان

احسانہ عمّ الخلائق کلّھا
اُکرم بہٖ مِن عالمٍ منّان

(میں ہمیشہ اِس کتاب کے مؤلف اور اِس کے شارح یعنی استاد الاساتذہ قاضی شوکانی صاحب کے حق میں دعائے خیر کرتا ہوں۔ قاضی صاحب ہی وہ عالم ہیں جنہوں نے دلائل و براہین کے ساتھ اِس کتاب کی شرح قیدِ تحریر میں لائی ہے۔ راست روی کے اسباب جمع کرنے میں اِن کا کوئی شریک نہیں ہے اور نہ عالمِ اِمکان میں ان کی کوئی مثال ہے۔ اِن کا احسان سارے لوگوں پر محیط ہے۔ اللہ انہیں اپنے فضل سے سرفراز کرے۔)

آخری شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے یہ نظم تھوڑے سے وقت میں ترتیب دی تھی۔

عبد الرشید و ھذہٖ ابیاتہٗ
تجزت بحسنٍ فی یسیر زمان [۱]

میر سیف الدین تارہ بلی والد کا نام فضل اللہ اور دادا کا نام نصر اللہ تھا، منطقی سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ سلطان سکندر شاہمیری (۱۳۸۹ھ تا ۱۴۱۳ھ) کے عہدِ حکومت میں اِن کے اسلاف حضرت میر سید محمد ہمدانیؒ کے قافلہ کے ساتھ واردِ کشمیر ہوئے۔ جن میں سید حسین علم منطق میں مہارت رکھنے کی وجہ سے منطقی مشہور ہوئے [۲]۔ میر سیف الدین صاحب عالم، شاعر اور متقی تھے۔

---

[۱] المنتقی: مقدمہ زیرِ عنوان "نُزُولُ مَنِ انتقی"، بقلم مولانا عبد الرشید شوپیانی کشمیری، مطبع فاروقیہ۔ دہلی۔ صفحہ ۳۵ [۲] تفصیل کے لئے تاریخ کبیر مؤلفہ محی الدین مسکین دیکھی جا سکتی ہے۔

کشمیر کے مشاہیر اہلِ علم سے استفادہ کیا تھا اور تصوّف میں اُس زمانے کے سب سے ممتاز بزرگ اور ولیؔ کامل شیخ احمد تارہ بلیؒ کے دامنِ ارادت سے وابستہ ہوئے۔ اس زمانے میں کشمیر کے بہت سے اہلِ علم پنجاب کے مختلف شہروں میں جاکر یہاں کے نامور علمائے سے استفادہ کرتے تھے۔ میر سیف الدین بھی لدھیانہ جاتے تھے۔ یہاں تک کہ وفات بھی وہیں پائی۔ سالِ وفات ۱۲۹۰ھ بیان کیا جاتا ہے[۱]

میر سیف الدین صاحب کشمیری زبان کے بلند پایہ شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ اس میں اِن کے کئی رسالے بھی شائع ہوئے ہیں جن میں ان کی مثنوی وامق عذرا بھی شامل ہے۔ وہ عربی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ اِس مثنوی کے حاشیہ پر اِن کی ایک مناجات اور ایک نعت موجود ہے۔ دونوں نظموں کے مجموعی اشعار کی تعداد ۳۳ ہے۔ ہم نمونے کے طور پر چند اشعار نقل کرتے ہیں :-

کریم ننتصر المستضر بینا
رحیمی نستتر المستغفر بینا

لک الافضال والاکرام والبر
لک الاحسان والانعام فاغفر

غفورُ التائبین اغفر ذنوبی
وعنّی بالندم فرّج کروبی

۱؎ سیف الدین تارہ بلی : ڈاکٹر مشعل سلطانپوری
مطبوعہ : کلچرل اکاڈمی ۔ سرینگر۔

أجرني يا مجير المستجيرين
وخرني يا نصير المستخيرين

تفضّل يا وحيداً بالتعزّز
كريم الصفح يا حسن التجاوز

تقبّل بالتولّي طيّباتي
وبالإحسان كفّر سيّآتي

أعزني ربّ من شر الشياطين
ومنّ بالذّات من كرّ الشياطين

بتقواك الكفاية والسلامة
بزلفاك الولاية والامامة

(اے خدائے کریم! تو ہی مدد کے طلبگاروں کی مدد کرتا ہے۔ اے بخشنے والے آقا، تو ہی بخشش کے خواستگاروں کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ تیرے ہی ہاتھ میں مہربانی کرنا، عزت بخشنا اور بھلائی کرتا ہے۔ صرف تو ہی احسان اور انعام دینے والا ہے۔ توبہ کرنے والوں کو تو ہی معاف کرتا ہے۔ سو میرے گناہ بھی معاف کردے، میں پشیمان ہو کر آیا ہوں، میرے دُکھ درد دور کردے۔ اے پناہ ڈھونڈنے والوں کی پناہگاہ، تو ہی مجھے پناہ دے، اے خیر کے

طلبگاروں کی مدد کرنے والے، میرے ساتھ نیک معاملہ فرما۔ تو وحدانیت کی صفت سے متصف ہے، اب تو ہی اپنے قدرت سے فضل فرما۔ تو ہی اے درگزر والے، ہم سے طریقے پر درگزر فرما۔ میری نیکیوں کو اپنے فضل وکرم سے قبول فرما اور میرے گناہوں کو اپنے احسان سے مٹا ڈال۔ اے پروردگار تو مجھے شیطان کے شر سے بچا اور شیاطین کے شر سے اپنی حمایت میں محفوظ رکھ۔ تیری ذات سے ڈرنے میں حفاظت اور سلامتی ہے اور تجھ سے قریب ہونے میں امامت و ولایت نصیب ہوتی ہے۔)

نعتیہ نظم بڑی عمدہ ہے، یہاں اس سے صرف پانچ شعر نقل کئے جاتے ہیں :-

حبیبٌ البطحیٌ بشرٌ نبیٌّ
قریشیٌّ بنی ھاشمیٌّ
نبیٌّ نورٌ الدنیا محیّاہ
صفیٌّ عطرٌ الاکوان ریّاہ
امام الانبیاء والاتقیاء
ھمام الاصفیاء والاولیاء
رسولٌ سابقٌ للخلق نورہ
وصول رحمۃٌ عظمیٰ ظہورہ
خلیل اللہ تعظیماً وقدراً
دلیلُ اللہِ تکریماً وصدراً [1]

---

[1] وامق عذرا: میر سیف الدین نارہ بلی: صفحہ ۱۲ (حاشیہ) سرینگر۔

(میرا محبوب پیغمبر وادئ بطحا سے تعلّق رکھتا ہے وہ مدنی اور قریشی ہے، وہ خاندانِ ہاشم سے نسبت رکھتا ہے، اس نے اپنے روئے انور سے پوری دنیا کو منّور کیا۔ وہ ایسا برگزیدہ ہے جس کی خوشبو نے کائنات کو معطّر کیا۔ وہ پیغمبروں اور پرہیزگار بندوں کا پیشوا ہے۔ وہی اولیا اور اصفیا میں بھی سب سے عالیمقام اور بلند مرتبہ کا مالک اور والی ہے۔ وہ ایسا پیغمبر ہے جس کا نور تمام مخلوقات میں سب سے پہلے ظاہر ہوا۔ اس کی رحمت ہر خاص و عام کے لئے۔ اس کا ظہور پوری آن بان رکھتا ہے۔ وہ خدا کا دوست ہے، اس لئے عزت و عظمت کا حق رکھتا ہے۔ وہ خدائی راہنما ہے اس لئے تکریم و احترام سے مخصوص"۔)

مولانا محمد انور شاہ کشمیری علاّمہ انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (ولادت ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء وفات ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء) یہاں کسی تعارف یا تعریف کے محتاج نہیں۔ ان کی زندگی، شخصیّت، علمی کمالات اور ملّی خدمات پر کئی مستقل کتابیں اور بیسیوں مقالات منظرِ عام پر آچکے ہیں، جن میں خاکسار مؤلف کی وہ کتاب بھی شامل ہے جو آج سے پانچ سال پہلے " علاّمہ انور شاہ کشمیری: شخصیت اور علمی کمالات " کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں ہم نے عربی شاعری کے پس منظر، اس کی کمیّت اور موضوعات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس لئے اسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے یہاں صرف ان کی عربی شاعری کے خاص پہلوؤں پر تھوڑی سی روشنی ڈالی جائے گی جس کی ہماری مذکورہ بالا تالیف میں کمی ہے۔ اس لیے تکرار کا کوئی سوال نہیں اٹھتا۔

حضرتِ شاہ صاحبؒ بنیادی طور پر عربی دینی تعلیم کے متبحّر عالم تھے اور

علوم دینیہ میں بھی ان کا خاص میدان فنِ حدیث تھا۔ تاہم وہ شعروادب کا بھی ستھرا اور پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ عربی اور فارسی کی کلاسیکی شاعری پر اُن کی گہری نظر تھی اور ہزاروں اشعار کے حافظ تھے[1] صرف و نحو، عروض و قوافی، بیان و بدیع وغیرہ کے امام تھے۔ ان کا ایک نمایاں وصف یہ بھی تھا کہ وہ فطرتاً حساس واقع ہوئے تھے۔ اسی طرح وہ مناظرِ فطرت سے متأثر ہوکر خالقِ فطرت کے جلال و جمال سے مسحور و مرعوب ہوئے تھے۔ اسی طرح خارجی واقعات بھی بڑی سرعت کے ساتھ ان کے اندر واردات جنم دیتے تھے۔ وہ فلسفہ اور عقلی علوم کے صاحبِ تصنیف عالم تھے مگر اس کے باوجود علمائے منطق و فلسفہ کی یبوست و صلابت سے ہر طرح سے پاک وصاف تھے۔ اُن کا تعلق راسخ العقیدہ طبقۂ علماء سے تھا مگر اس کے باوجود انہیں کٹّرپن اور عبوست نے چھوا بھی نہیں تھا۔ وہ غم اور دُکھ کے معمولی حادثے سے بھی غیر معمولی چوٹ محسوس کرتے تھے اور خوشی کے ادنیٰ واقعہ سے جھُوم اُٹھتے تھے۔ یہی وہ فطری خصوصیات اور کسبی کمالات ہیں جنہوں نے مولانا محمد انور شاہ محدّث کو کبھی کبھی شعر کہنے کی طرف بھی مائل کیا۔ یہاں تک کہ ان کی عربی شاعری کا ایک معقول مجموعہ تیار ہوا۔

شاہ صاحبؒ کی عربی شاعری اگرچہ متنوع مضامین پر مُشتمل ہے، تاہم اسے آسانی کے لئے تین حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

شاہ صاحبؒ کی شاعری کا پہلا حصّہ اُن قصائد پر مشتمل ہے جن میں انہوں نے اپنے نامور اساتذہ، مشائخ اور معاصرین کے اِنتقال پر درد بھرے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ اِن میں وہ خود بھی روتے نظر آتے ہیں اور دوسروں کو بھی رُلاتے

---

[1] حیاتِ انور: تالیف: مولانا ازہر شاہ قیصر: مقالہ: مولانا سید احسن گیلانی مرحوم

ہیں۔ یہ قصائد ان کے لطیف احساسات اور گہری بصیرت کا روشن ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے بزرگوں کے علم وفضل، سیرت وصورت، اخلاص وللہیت اور علمی وتربیتی خدمات کا جس پختہ کاری اور اثر آفرینی سے نقشہ کھینچ لیا ہے۔ اس سے زیادہ کوئی سرکردہ فطری شاعر پیش نہیں کرسکتا۔ ان قصائد میں اُن کا علم وفکر اور جذبات وعواطف ایک ساتھ اور ایک ہی رفتار کے ساتھ چلتے ہیں۔ کوئی کسی پر حاوی نہیں ہوتا۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمد حسن صاحبؒ کے انتقال پر اُنہوں نے جو مرثیہ لکھا ہے اس کی ابتداء ان اشعار سے کی ہے :-

قفا نبكِ مِن ذكرىٰ مزار فندمعا
مصيفاً وهشتاً ثمّ مرأى ومسمعا

نهضتُ لأرثي عالماً ثمّ عالماً
حديثاً وفقهاً ثمّ ما شئتَ اجمعا
وهدياً وسمتاً سُنّةً وجماعةً
وخلقاً وخُلقاً ما أُناف وأوسعا

كبيراً ينادي في السماوات أُمّةً
امام الهدىٰ شيخاً اجلّ وأرفعا[1]

(میرے دو دوستو ! ذرا اس زیارت گاہ پر تھوڑی دیر کے لئے رُک جاؤ تاکہ ہم وہاں تھوڑی دیر کے لیے آنسو بہا سکیں۔ چاہے سرما ہو یا گرما، یہ جگہ ہر وقت

---

[1] نفحة العنبر : ص ۱۶۰ تا ۱۶۱

زیارت کے قابل ہے...... میں آج ایک ایسے عالم پر ماتم کرنے کے لئے اُٹھا ہوں جو اپنے اندر ایک عالم سمیٹے ہوئے تھے (اسلیے یہ ایک عالم پر ماتم کرنا ہے)۔ جو فقہ و حدیث کا ماہر کامل اور جملہ علوم کا عالم تھا۔ جو سیرت و صورت، سنت و جماعت، مزاج و اخلاق اور بلندی و یکتائی میں اپنی نظیر آپ تھا...... ایسی عظیم شخصیت جو آسمانوں میں "اُمت" سے موسوم ہے۔ جو اپنے وقت میں قیادت کے علمبردار، جلیل القدر بزرگ اور عظیم القدر شیخ و مُربّی تھے)۔

شیخ الہند کی صورت و شمائل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

اِذا جئتَهٗ وافيتَهٗ مُهلّلاً
كبدرٍ مبينٍ من جبينٍ و اُوسعا
وغُرّتُهٗ سيما السجود وبشرهٗ
تباشيرُ صبحٍ او كمسكٍ تضوّعا

(اگر تم اس کے پاس آجاتے تو اسے نورانیت کا پیکرِ مجسّم پاتے، جس کی کشادہ پیشانی کھلے آسمانوں پر چودھویں رات کے چاند کے مانند نظر آتی ہے۔ اس کی پیشانی کی چمک اس کے سجدوں کا نشان ہے۔ اُس کی پُر رونق کشادہ روئی ہنستے صبح کی خوشخبری یا مہکتی خوشبو کا جھونکا ہے۔)

کس حکیمانہ انداز میں اپنے شیخ کے علم و فضل کا نقشہ کھینچا ہے:۔

اخاطب جيناً قبرهٗ و ضريحهٗ
بما قالهٗ مَن قالهٗ ثُمّ اُبدعا

نعم قد وسعت العلم و العلم میّت
ولو کان حیًا ضقت حتّیٰ تصدّعا

وکان حشا اُذنیّ درًا و حکمۃً
فتخرجُ من عینیّ دمعاً مرصّعاً

معارف معروفٍ وآداب حاتم
اذکر حتّیٰ یقول فاسمعا

(میں کبھی ان کی قبر سے مخاطب ہوکر وہی کہتا ہوں جو کسی کہنے والے نے ایسے ہی کسی موقعہ پر بڑی عمدگی سے کہا ہے یعنی ہاں اے قبر! تم نے آج ایک کوہِ علم کو اپنے اندر سمیٹ لیا مگر ایسا جب ہی تم کر سکی جب وہ زندہ نہیں ہے۔ اگر وہ زندہ ہوتا اور تو ایسا کرنے کی ہمت کرتی تو تم تنگ ہوکر پھٹ جاتی۔ میرے استاد جب تک زندہ تھے تب تک میرے کانوں کو علم اور حکمت کی موتیوں سے بھر دیتے تھے۔ اب جب وہ دنیا سے رخصت ہوئے تو وہی علم وحکمت کے موتی میری آنکھوں سے آنسوؤں کی شکل میں مالا پروتے ہوئے بہہ رہے ہیں۔ میں جب بھی اُن کے وہ معارف (جو معروف کرخی رح کے علوم و معارف سے مشابہت رکھتے تھے اور اُن کے وہ اوصاف و محامد جن میں وہ حاتم اَصمّ رح سے مماثلت رکھتے تھے) یاد کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس وقت بھی یہ معارفِ علمی ارشاد فرما رہے ہیں اور میں سن رہا ہوں۔)

شیخ الہند کی عام مقبولیت و محبوبیت اور برصغیر کے مسلمانوں میں اُن کے تئیں احترام و عقیدت کا حال کس درد اور کسک مگر پُروقار انداز و اسلوب میں بیان کرتے ہیں، ان کے جنازے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

بکتہُ سماءٌ ثُمَّ أرضٌ کِلا ھُما
ومینٌ و قلبٌ قاسیاہُ فاجمعا

سریٰ نعشہ فوق الرّکاب وطالما
سریٰ علمہ فوق الرّکاب ورفعا

وَشیّعۃ المخلوقُ مِنْ کلّ جانبٍ
فلم أرَ الّا الفضل کان مودّعا

ولم أرَ مثل الیوم کم کان باکیاً
وما کان دمعُ القوم دمعاً مضیّعا

ولم أدرِ ماذا کان احرام حجّہ
أکان قِراناً امْ أحبارٍ تمتّعا

(ان کے اِنتقال پر آسمان اور زمین نے رویا، یہاں تک کہ جن کے دِل سخت اور آنکھیں مضبوط تھیں، اُنہوں نے بھی مِل کر آنسو بہایا۔ آج اُن کا جسدِ خاکی لوگوں کی گردنوں پر تیر رہا ہے۔ جبکہ اِس سے پہلے ان کا علم قافلوں پر

سوار ہو کر چلا کرتا تھا اور بلندیوں کو چھوتا تھا۔ اس کو رخصت کرنے کے لیے ہر جانب سے خلائق نے مشایعت کی۔ میں نے دیکھا کہ عظمت و بزرگی کو الوداع کہا جا رہا تھا۔ آج کا جیسا دن میں نے کبھی نہیں دیکھا ہے کہ کتنے لوگ آنسو بہا رہے تھے جو آنسو ضائع ہونے والا نہیں ہے۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ آیا حضرت شیخ نے حج کے لئے یہ احرام (کفن) باندھا تھا، یا انہوں نے حجِ قران یا حجِ تمتّع کے لیے نیت کی تھی۔)

یہی حال ان کے دوسرے قصائد کا ہے جن کا ایک ایک شعر دل کے اندرون کو چھوتا ہوا گزرتا ہے۔ خاص طور سے وہ قصائد جو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہما کے انتقال پر نظم کئے گئے ہیں۔ علّامہ انور شاہ صاحب نے ان دو بزرگوں کے اوصاف و کمالات پر کوئی کتاب یا مقالہ نہیں لکھا ہے مگر یہ دو مراثی دوسری تمام تفصیلات سے مستغنی کر دیتی ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی شاعری کا دوسرا اہم حصہ حماسی شاعری سے مشابہت رکھتا ہے۔ ہماری مراد اُن قصائد سے ہے جو اسلامی حمیّت اور دینی غیرت سے لبریز ہیں۔ دشمنانِ اسلام کی اسلام دشمنی سے وہ بے چین اور مضطرب ہوتے تھے اور مسلمانوں کے کسی بڑے کارنامے اور وقیع مرتبے سے جھوم جاتے تھے۔ اس نوع کی شاعری میں کچھ قصائد المیہ ہیں اور کچھ طربیہ۔ المیہ شاعری میں وہ قصیدے اور نظمیں پیش کی جاسکتی ہیں جو شاہ صاحبؒ نے مرزائیت کی تردید میں لکھی ہیں۔ وہ اس مذہب اور اس کے داعی کی جملہ حرکات و سکنات پر غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ یہ تحریک ایک

خوفناک باطنی سازش اور عقیدۂ ختمِ نبوّت کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ انہیں اس پر شرحِ صدر ہوا تھا کہ اِس سازش کے اصل فنکار مغربی دُنیا کے سیاسی اور مذہبی شاطر ہیں، پنجاب کے ایک سادہ لوح شخص کو اِس کا آلۂ کار بنا دیا گیا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے بروقت مسلمانوں کو خبردار کیا اور اِس اندھے فتنے کو اُبھرنے سے پہلے ہی مٹا دینے پر آمادہ کیا۔ اِس قسم کی شاعری میں ان کا وہ قصیدہ دینی غیرت سے لبریز ہے جو "اِکفار المُلحدین" میں پایا جاتا ہے۔ اس کی ابتداء وہ اِس طرح کرتے ہیں:۔

اَلا یا عبادَ اللہ قُوموا و قَوِّموا
خُطُوبًا اَلَمّتْ مَا لَهُنَّ بدان
وقد کان ینقضّ الهُدیٰ و منارهٗ
و زحزحَ خیرٌ ما لذالكَ تدان
یُسبّ رسولٌ مِن اُولی العزم مِنکم
تکادُ السمآءُ والأرضُ تنفطران
وحاربَ قومٌ ربّهُم و نبیّهٗ
فقُوموا لنصرِ اللہ اِذ هو دان

(اے اللہ کے بندو کھڑے ہو جاؤ، دین کی درستی اور حفاظت کرو، مصیبتیں نازل ہونے لگیں جو ناقابلِ برداشت ہیں۔ قریب ہے کہ ہدایت کے منارے ٹوٹ کر گر پڑیں اور خیر اِس طرح رخصت ہو جائے کہ پھر قریب نہ آسکے۔ ایک ایسے جلیل القدر پیغمبر (حضرتِ سیّدنا عیسیٰؑ) کو تمہاری موجودگی میں بُرائی سے یاد کیا جا رہا ہے جو اولو العزم ہیں۔ قریب ہے کہ زمین اور آسمان پھٹ جائیں۔ ایک

جماعت اپنے خدا اور اس کے رسول سے جنگ کرنے پر آمادہ ہوئی ہے، پس خدا کی مدد کے لئے کھڑے ہو جاؤ جو تمہارے ساتھ ہے)

اِن کی اضطرابی کیفیت کا تھوڑا سا اندازہ اِن اشعار سے لگایا جاسکتا ہے:۔

وقد عیل صبری فی انتهاك حدوده
فهل ثمّ داعٍ أو مجیبُ اذانی

واِذ عزّ خطبٌ جئتُ مستنصراً بکم
فهل ثمّ غوثٌ بالقومِ یدانِ

لعُمری لقد نبهّتُ من کان نائماً
واسمعتُ من کانت له اذنان

(پس حدود اللہ کے اس طرح پھاندے جانے سے میرا سکون دب گیا، کیا اللہ کی طرف کوئی بُلانے والا یا میری پکار کا جواب دینے والا ہے۔ جب مُصیبت بڑھ گئی تو میں تمہارے پاس مدد کا خواستگار ہو کر آیا، تو اے میری قوم، پھر کیا کوئی فریاد رسی کرنے والا ہے؟ قسم ہے مجھے اپنی عمر کی۔ میں نے ہر اُس شخص کو بیدار کیا جو سویا ہوا تھا اور میں نے ہر اُس شخص کو اپنی فریاد سُنائی جو سماعت کی صلاحیت رکھتا ہے۔)

اسی زُمرے میں علامہ انور شاہ صاحبؒ کے وہ نعتیہ قصائد بھی شامل کئے جاسکتے ہیں جن کے ایک ایک لفظ میں وہ عشقِ نبوی سے سرشار نظر آتے ہیں جس ذاتِ مقدسہ کے طفیل گری پڑی انسانیت کیمیا بن گئی، کیا بیسویں صدی سے تعلق رکھنے والے اِنسانوں پر اِن کا کوئی احسان نہیں ہے؟ کیا سطحِ زمین پر

کروڑوں مسلمانوں کی موجودگی میں کوئی شقی اور غبی اگر اپنی بدبختی کے نتیجہ میں ذاتِ اقدس کی طرف گستاخانہ اُنگلی اُٹھانے کی جرأت کرے تو کیا مسلمان خاموش تماشائی بن بیٹھیں گے؟ یہی وہ اضطرابی کیفیت تھی جس کو سکون پہنچانے کی غرض سے وہ نعتیں منظوم کرتے تھے، چونکہ انہیں عربی اور فارسی پر اہلِ زبان کی طرح عبور تھا اس لیے وہ بارگاہِ نبوت میں عقیدت و احترام سے بھرے ہوئے جذبات اور احساسات ادا کرنے میں کوئی اُلجھن محسوس نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ اُنہوں نے کئی طویل نعتیں کہی ہیں مگر ہم ان میں سے صرف ایک شاندار نعت سے چند اشعار بطورِ نمونہ درج کرتے ہیں:-

برق تألق موهناً بالوادی
فاعتاد قلبی طائف الأبعاد

اسفاً علی عهد الحمی و عهاده
تولی علی الابراق و الأرعاد

رهم تناوح تارة دیم لها
حتی غدا الایام کالاعیاد

هبّ النسیم علی الربی فتضاحکت
بشری العبید عرارها والجادی

لعبت صباها والشمال و تارة
لعب الغصون بعطفها المیاد

(آدھی رات کے وقت ایک وادی میں بجلی چمکی جس سے میرا دل کسی کھوئے ہوئے خیال میں گم ہوگیا۔ سوزشِ عشق کے اس گزرے ہوئے زمانے پر

آج دُکھ ہوتا ہے جب بجلی اور کڑک کے ساتھ مسلسل بارشیں رہتی تھیں۔ وہ نرم مگر لگاتار بارش جس میں کبھی تیزی آتی تھی، اس سے دن خوشی اور شادمانی سے عید کی مانند ہوجاتے تھے۔ جب بادِ نسیم اس کے ٹیلوں کے اوپر سے گزرتا تھا تو وہ اس کے اثر سے ہنسنے اور ہنسانے لگتے تھے اور بنجر کو بھی شادابی اور گُل پوشی کی بشارت دیتے تھے، پھول بھی وہ جو گلِ زعفران اور گُلِ گاؤ چشم سے موسوم ہیں، کبھی اس کی پُروائی ہوا کھیلنے لگتی اور کبھی شمالی ہوا جس طرح کسی درخت کی شاخیں جھومنے والے عشقِ پیچاں کے ساتھ کھیلتی ہیں۔")

اس کے بعد نفسِ مضمون کی طرف آتے ہیں اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت و شمائل، خصائل اور عاداتِ مبارکہ، فیضِ عام اور رحمتِ تمام وغیرہ بیان کرنا شروع کرتے ہیں اور بارگاہِ نبوّت میں لُغتِ عربی سے وہی الفاظ چُن چُن کر استعمال کرتے ہیں جن کی تعظیم کائناتِ ارض و سماء میں عرشِ مجید سے بھی بلند اور نازک تر ہے:-

انا فی امانٍ من داوی حبیرہٖ
ولی اِھتداءٌ بالنبیّ الھادی
شمس الضحیٰ بدر الدّجیٰ صدر العُلیٰ
علم الھُدیٰ ھو قدوۃ للقادی
مولی الوریٰ و بشیرھم و شفیعھم
و خطیبھم فی مشھد الاشھاد
من سیّد عبد الالٰہ و حمدہٗ
وحبیبہٗ و خلیلہ الحمّاد

سهل العريكة اکرم العرب الاُولیٰ
خیر العباد وخیرۃ العُبّاد

(مجھے کیا غم ہے، میں اسی نبیؐ ہادی کی راہنمائی کی برکت سے تاریک رات کی ظلمت میں بھٹکنے سے محفوظ ہوں۔ وہ پیغمبر اکرمؐ، جو دن کے روشن آفتاب، تاریک رات کے ماہِ کامل، مرتبے کے بلند، رشد و ہدایت کے منارہ اور راہنماؤں کے راہنما ہیں۔ کائنات کے آقا، اہلِ عالم کے لئے نجات دینے والے اور شفاعت کرنے والے اور شہادت گاہِ قیامت میں حاضرین کے لئے نجات کا پیغام سُنانے والے ہیں۔ آپ وہ سردارِ عالم ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور حمد و ثنا کی۔ اس طرح آپ اللہ کے سب سے زیادہ حمد و ثنا کرنے والے خلیل اور حبیب ٹھہرے۔ بے حد نرم خُو پیغمبر، بزرگ ترین عرب، تمام مخلوقات میں افضل اور تمام عبادت گزاروں میں برگزیدہ)۔

اس میں شبہ نہیں ہے کہ فارسی نعتیہ شاعری ہر حیثیت سے عربی نعتیہ شاعری پر فوقیت رکھتی ہے۔ کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ، اور شیخ شرف الدین البوصیری مصری رحمتہ اللہ علیہ کے دو مشہور نعتیہ قصائد (قصیدہ بانت سُعاد اور البردۃ) اب بھی نعتیہ شاعری میں بے مثال ہیں۔ جن نعت گو شعرا نے ان کے تتبّع میں اچھے اچھے قصیدے ترتیب دیئے، انہیں بھی اعتراف ہے کہ وہ اس ذروۂ کمال تک پہنچ نہیں سکتے جس پر حضرتِ کعب اور شیخ بوصیری فائز ہیں۔ ان دو قصائد کے علاوہ اور جتنے بھی نعتیہ قصیدے عربی میں لکھے گئے، (خاص طور پر خود علامہ محمد انور شاہ محدّث کے زمانے میں جن شعراء نے اس فن شریف (البدیعیات) میں طبع آزمائی کی، جن میں مصر کے امیر الشعراء احمد شوقی مرحوم بھی

شامل ہیں) ان میں شاہ صاحب کے قصائد فصاحت و بلاغت، خلوص و عقیدت اور اثر آفرینی میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ بلکہ وہی ایک قصیدہ، جس کے اوپر چند اشعار نقل کئے ہیں ان کی قادر الکلامی، مقامِ نبوّت سے شناسائی، عشق رسول ؐ سے سرشاری اور امّت اسلامیہ کی سربلندی کے لئے اضطراب و بے چینی کا اندازہ لگانے کے لئے کافی اور وافی ثبوت پیش کرتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے یہ قصیدہ اس وقت لکھا ہوگا جب دل کسی گہرے گھاؤ کا نشانہ ہو گیا تھا۔ فتنۂ قادیانیت اور عقیدۂ ختمِ نبوّت کے خلاف انگریزوں کی سازش سے اِن کا دِل پہلے ہی سے مُضطرب تھا مگر کوئی اور زخم بھی تھا جس نے انہیں ایک عمدہ سی نعت کے ذریعہ سکون حاصل کرنے کی طرف مائل کیا تھا۔ بڑی شخصیتیں بقولِ خلیل جبران کسی سخت حادثے سے دوچار ہونے کے وقت خاموشی اختیار کرتی ہیں اور وہ خاموشی بذاتِ خود ایسی ہوتی ہے کہ اس کے آگے چٹانیں بھی ریزہ ریزہ ہوتی نظر آتی ہیں۔ علومِ نبوّت کے وارث بھی ایسے مواقع پر صرف انّما أشکو بثّی وحُزنی الی اللہ کہہ کر باطن کا زیادہ سے زیادہ سراغ لگانے میں کھو جاتے ہیں۔ احقر کا خیال ہے کہ حضرت مولانا انور شاہ ؒ کو یہ زخم مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند سے ترکِ تعلق کے نتیجے میں پہنچا تھا جس کی ترقی و سربلندی کے لئے اُنہوں نے اپنی پوری زندگی وقف کر رکھی تھی اور اس راہ میں مالی منفعت، دنیوی مناصب، وطن سے دوری اور احباب و اقارب کی کشش کوئی چیز حائل نہ ہوئی تھی۔ مگر دارالعلوم کے اربابِ اہتمام نے ۱۹۲۷ء میں آپ کو اِن خدمات کا صلہ جس شکل میں دیا اس نے پورے برّصغیر کے دانشوروں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اربابِ اہتمام نے (غفر اللہ لہم) جس وسیع پیمانے پر

شاہ صاحب اور ان کے رفقاءؒ کے خلاف کردار کشی اور آبرو ریزی کی مہم چلائی تھی، اس کا جواب اُنہوں نے بذاتِ خود کچھ نہیں دیا مگر علمائے ہند نے اس شکل میں دیا کہ اسی سال (۱۹۲۷ء) کے اختتام پر پشاور میں جمعیۃ علماءِ ہند کا سالانہ سہ روزہ اجتماع ہونے والا تھا جس کے لئے برّ صغیر کے جلیل القدر علماء، اربابِ سیاست اور مفکّرین نے علّامہ محمد انور شاہ کشمیری کو متفقہ طور صدر منتخب کیا۔ اور جس میں علّامہ سیّد سلیمان ندوی، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا سیّد فضل الحسن حسرت موہانی بھی شامل تھے۔ مگر بہر حال دار العلوم سے جدائی شاہ صاحب کے لیے کسی خطرناک سانحہ سے کم ثابت نہیں ہوئی۔ اُن کے عزیز ترین تلمیذ ارجمند مولانا محمد یوسف صاحب بنوّری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اگرچہ وہ بہت کم زبان سے اس کا ذکر کرتے تھے اور نہایت صبر و شکیبائی سے کام لیتے تھے مگر:-

اذا ذکر منھا شیئاً تراہُ	جب بھی اس حادثہ کا کوئی ذکر اُن کے
انّ قلبہٗ یقطر دما	سامنے چھڑ جاتا تھا تو گویا اُنکا دِل خون بہاتا تھا۔

غرض ہماری رائے میں یہی وہ حادثۂ فاجعہ تھا جس کے نتیجے میں یہ پُر اثر نعت وجود میں آئی۔ نعت کے اِن دو آخری اشعار سے بھی شاید ہماری اس رائے کی تائید ہوتی ہے:-

قِف منک ۲ طلالا وھت ازکانھا
أغنیٰ علیھا الدّھرُ بالمرصاد
بالرّبما ارثی الطلول فما ھُنا
داعٍ ولا مستمع إنشادی[1]

[1] نفحۃ العنبر: ص ۲۶

(اے ہم سفر! ذرا تھوڑی دیر کے لئے اِن ٹیلوں پر رُک جاؤ، جس کی بُنیادیں اب ڈھیلی اور کمزور ہوگئی ہیں۔ اصل میں زمانہ پہلے ہی سے ناک میں بیٹھا تھا، یہاں تک کہ اس نے ان کے ساتھ بے وفائی کی۔ آج جب کبھی میں ان ٹیلوں پر بیٹھ کر آہ وزاری کرتا ہوں تو وہاں نہ کسی بلانے والے کو دیکھتا ہوں اور نہ وہاں میرے اشعار سُننے کے لئے کوئی موجود ہے۔)

ملّی شاعری میں ہی ان کا وہ شاندار قصیدہ بھی شامل ہے جس میں ان کا معنوی وجود جھوم رہا ہے۔ ۱۹۲۳ء میں کمال اتاترک نے غیر متوقع طور پر انگریزوں کو شکستِ فاش دے کر پوری دُنیا کے مسلمانوں سے مُردنی اتار کر ان میں مسرّت و شادمانی کی لہر دوڑادی۔ عظیم عثمانیہ سلطنت کے حصّے بخرے کر کے کس کو یقین تھا کہ ترکی اِس زد سے بچ جائے گی، مگر مصطفیٰ کمال نے جس ہمّت وصولت کا مظاہرہ کرکے یونان اور اِس کے اتحادیوں کا جھوٹا وقار خاک میں مِلادیا اِس سے اسلامی دنیا میں نیا ولولہ، مسلمان زعمائیں نیا حوصلہ اور نوجوانوں میں نیا جوش وخروش پیدا ہوا۔ اگرچہ کمال اتاترک کی ذاتی زندگی اور بعض اصلاحات سے برصغیر کے مسلمانوں میں مایوسی بھی پیدا ہوئی مگر اس نے اپنی قومی غیرت اور غازیانہ کارناموں سے لوگوں کے دلوں پر جو نقوش مرقم کئے ان کے آگے ان کی خامیاں اوجھل ہی رہیں۔ ۱۹۲۳ء میں جمعیتہ علمائے ہند کا سالانہ جلسہ بہار میں "گیا" کے مقام پر ہوا اور دیوبند کا ایک وفد علاّمہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کی قیادت میں اِس میں شریک ہوا۔ حضرتِ شاہ صاحبؒ نے وہیں ایک طویل طربیہ قصیدہ قلمبند کیا اور جلسے میں پڑھ کر سُنایا۔ یہ قصیدہ فنّی حُسن، ادبی لطافت، علمی وقار اور دینی و ملّی حمیّت کا جیتا جاگتا نمونہ ہے جس میں وسیع معلومات، دینی جذبہ اور اتحادِ

اِسلامی کی تمنّا پوری مہارت سے ودیعت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ وہ ایام تھے جب ابھی کمال اتاترک نے اصلاحات کے نام پر تجدّد کا نعرہ بلند نہیں کیا تھا۔ اس لئے مسلمان اسے بغیر کسی تردّد کے اِسلام کا غازی اور مجاہد کہتے تھے لیکن جب اس نے کچھ ہی دنوں کے بعد خلافت کے خاتمے اور لادینی سیاست اپنانے کا اعلان کیا تو مسلمانوں میں بڑی مایوسی ہوئی۔ اسی مایوسی کے نتیجے میں بعض زعماء اور دانشوروں نے کھُلی مخالفت کی اور بعض حضرات نے سکوت اختیار کیا۔ جن لوگوں نے خاموشی اختیار کی اِن کی خاموشی کے پیچھے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ کمال اتاترک کی اصلاحات کو وقتی مجبوری کا نتیجہ سمجھتے تھے انکے نزدیک اس کا عظیم الشان غازیانہ کارنامہ ہر حیثیت سے بھاری تھا اور جسے وہ مسلمانوں کے حق میں دوررس نتائج کا حامِل سمجھتے تھے۔ حضرتِ مولانا انورشاہ صاحبؒ بھی اُنہی دانشوروں میں شامِل تھے جو کمال اتاترک کے خلاف کھلی بغاوت اور مخالفت کو نامناسب سمجھتے تھے۔ اپنے قصیدہ میں اُنہوں نے مُصطفیٰ کمال کی بہادری اور آہنی عزم کی کھُلی داد دی ہے اور راقم کو علم نہیں کہ اُنہوں نے بعد میں اس سے رجوع کیا ہو۔ بہرحال وقت نے ثابت کیا کہ جن علماء اور اربابِ سیاست نے کمال اتاترک کے حق میں نرم گوشہ اختیار کیا تھا، اُنہوں نے گہری بصیرت کا ثبوت پیش کیا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں جب ہندوستان کی مُسلم لیگ نے، جو اس وقت بلند پایہ علماء، اربابِ سیاست اور بڑے بڑے دانشوروں پر مشتمل تھی، مصطفیٰ کمال کے اِنتقال پر تعزیتی قرارداد پاس کی تو اس میں اُسے "اِسلام کا غازی اور مسلمانوں کا عظیم بہادر لیڈر" کے طور پر یاد کیا گیا۔

اِس قصیدے کا عنوان "غدارۃ الیونان و البرطانی" ہے۔

اصل قصیدہ شروع ہونے سے پہلے بارہ[12] اشعار پر مشتمل ایک خطبہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی بیان کی گئی ہے کہ وہ ہر خیر و شر کا مالک، نفع و ضرر کا خالق اور احکم الحاکمین ہے۔ ساری دنیا اسی کے دستِ قدرت میں ہے۔ بندے کو اس کی رحمت سے ناامید نہیں ہونا چاہیئے۔ جہاں اس کا امتحان سخت بھی ہوتا ہے، وہاں اُس کی رحمت کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ اِس کے بعد اصل قصیدہ شروع ہوتا ہے جس کی ابتدا، اس طرح ہوتی ہے:-

أَوَ ما ترىٰ لمّا عدَت عن طورها
غدّارة اليونانِ والبرطان

حتّٰی غدوا لا یؤمنون لربّهم
وتنصلوا من خلقةِ الانسان

فانزاد شرٌّ فی بسیطةِ منهم
ما کان یحکیٰ منذ جنکز خان

أوما ترق عینهم اوقلبهم
من رحمة الصبیانِ والنسوان

(کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جب بد دیانت اور رسوائے زمانہ عہد شکن یونان اور برطانیہ کا وطیرہ حد سے نکل گیا، یہاں تک کہ ان خائنوں کی یہ حالت ہو گئی کہ خدا پر اِن کا ایمان ہی اُٹھ گیا اور ایسے بے لگام ہو گئے کہ انسان کی

فطرت اور سرشت سے ہی نکل گئے، ان کی وجہ سے سطح زمین پر ایسا شر و فساد پھیل گیا جس کی مثال چنگیز خان کے زمانے سے نہیں سُنائی دی، ان کی سنگ دلی کا یہ حال ہوا کہ بچوں اور عورتوں پر نہ ان کی آنکھیں نم ہوئیں اور نہ دِل پسیج گئے"۔

ان کی بربریت اور انسانیت سوز طریقۂ کار کا ذِکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اچانک اللہ تعالیٰ کی قدرت حرکت میں آئی:۔

حتیٰ تدارك رحمة من ربّنا
من دولةِ الاسلام من عثمان
من جهبذ ماضی العريكة صادم
حامی الحقيقة قارع مزدان
المصطفیٰ الغازی الكمال فهدّهم
صرعیٰ وهلكیٰ اهل نری من غان

"اچانک اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی جس نے سلاطینِ عثمانیہ کی اسلامی حکومت کو تھام لیا۔ اسی سلطنت کے ایک رکن مصطفیٰ غازی کمال نے انسانیت کے اِن دشمنوں کو تہ و بالا کر دیا اور ان کو اِس طرح پچھاڑ دیا اور ہلاک کیا کہ تم نے اِن میں سے پھر کسی کو زندہ نہیں پایا۔"

اس کے بعد ابوطیب احمد المتنبّی اور ابّو تمام جیب بن اوس الطائی کی طرح حکیمانہ خیالات کا اظہار کیا ہے کہ جب خدا کی زمین پر ظلم و عدوان بڑھ جاتا ہے تو اللہ کی صفتِ جلالی بھی جوش میں آتی ہے۔ جب گھٹا ٹوپ اندھیرا ہر طرف چھا جاتا ہے تو اندھیری رات کے مسافروں کی رہنمائی کیلئے

ماہِ کامل بادل کے پردوں سے نمودار ہوتا ہے۔ جب کچھ خطرناک بیماریاں جڑ پکڑتی ہیں تو فاسد مواد کے اخراج کے لئے عملِ جراحی ناگزیر بن جاتی ہے۔ آگے دنیا کے مسلمانوں پر سلجوقی اور عثمانی سلاطین کے گوناگوں احسانات اور اسلام کی سربلندی کے لئے ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ اس کے بعد سمرنا کی طرف متوجہ کراتے ہیں جہاں کمال اتاترک نے یونانیوں کی کمر ہمت توڑ دی اور تلوار کا جواب تلوار سے دے کر ان کی ایک بڑی تعداد کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔

فاسال سُمَرنا ما اصاب عُداتهم ۔ من هدّة لما التقى الجمعان
تركوا كاسٍ دابرٍ واستوصلوا ۔ وسُقوا كؤوس الموت كالعطشان
والنصك من اسر الحيواة رقابهم ۔ والقتل اشفى ما يراه العانى

... ...

لم يبق من بيكيهم وبنوحهم ۔ الا غرابُ البين من سرطان
جعل المقدّر كيدهم فى نحرهم ۔ وكما تدين تدان من ديان
ولطالما طبعوا بمعودّيتنے ۔ فاتا اصطبا غهم باحمرقان
سطع الهلال فكانَ غرّة شهرنا ۔ سلخ الوبال لِاُمّة الصلبان

(سمرنا سے پوچھو کہ جب دو فریق ٹکرا گئے تو دشمنوں پر ترکی دھماکے سے کیا گزری یعنی وہ کھلی رسوائی اور نامرادی سے دوچار ہوکر ایک دوسرے پر گر پڑے اور ہانپتے ہوئے پیاسوں کی طرح موت کے پیالے پینے لگے۔ زندگی کی بندش

سے اِن کی گردنیں جُدا ہوگئیں، خدا جب مناسب سمجھتا ہے تو کسی قوم کے لیے قتل و بربادی سے ہی فائدہ پہنچاتا ہے۔ ... ...

... سمرنا میں ان کی (اہلِ یونان اور ان کے حلیفوں) یہ حالت ہوگئی کہ اِن پر رونے اور ماتم کرنے کے لئے بھی کوئی زندہ نہ بچ سکا، صرف ایک منحوس کوا، جو برطانیہ سے تعلق رکھتا ہے۔ تقدیرِ الٰہی نے ان کی تدبیر اور سازش اِن ہی کے خلاف بروئے کار لائی، اِس طرح اللہ کے حکم سے جس نے جیسا کیا تھا اس نے ویسا ہی بھرّا۔ آج تک یہ لوگ بہتیرے سے اپنے آپ کو رنگین کیا کرتے تھے۔ اب اگر آج اپنے ہی خون سے رنگین ہوئے تو کیا ہوا۔ آسمان پر ہلال بلند ہوا جو ہمارے لیے نئے دور کے آغاز کا پیغام لے کر آیا جبکہ صلیبی اقوام کے لئے اپنے کرتوتوں کی سزا کی تنبیہہ بھی سُناتا ہوا آیا۔)

غرض یہ قصیدہ مذہبی جوش و خروش سے لبریز اور انقلابی تأثرات سے بھرّا ہے۔ جس میں واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مذہب اور سیاست دو جُدا چیزیں نہیں ہیں۔ طاقت کا استعمال بعض اوقات ناگزیر بن جاتا ہے۔ خدا کی زمین پر ظلم و عدوان مٹانے کے لیئے سخت رویّہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ نیز خدا اس قوم کی حالت تب تک ہرگز نہیں بدلتا، جب تک وہ قوم اپنی حالت آپ بدلنے پر آمادہ نہ ہو جائے۔ اسی طرح ایک قوم یا فرد کو یہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیئے کہ خدا کے یہاں دیر ضرور ہوتی ہے مگر اندھیر نہیں ہوتی۔ وہ ظالموں کو ضرور ڈھیل دیتا ہے مگر اس کی گرفت بھی سخت ہوتی ہے۔ وہ جب زمین میں شر و فساد کو حد سے تجاوز کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کی غیرت جوش میں آکر اس کا تدارک بھی کرتی ہے۔ اِس لیے ظالموں، خائنوں اور اللہ کی زمین میں فساد پھیلانے

والوں کو اللہ کے عذاب و عتاب سے بے خوف نہیں رہنا چاہیئے [1]

مولانا محمد انور شاہ صاحب کی شاعری کا تیسرا حصّہ وہ ہے جو ٹھوس علمی اور فکری مسائل پر مشتمل ہے اور ان کے ذخیرہ کلام میں یہی حصّہ کمیت کے اعتبار سے زیادہ ہے۔ ادب و شعر کے بارے میں ان کی ایک رائے یہ بھی تھی کہ اس سے مشکل علمی مسائل اور غامض مباحث کو آسان، قریب الفہم اور بلیغ انداز بیان میں پیش کرنا چاہیئے، وہ ادب کے دائرے کو وسعت دینے کے حق میں تھے اور اسے گل و بلبل کے عشقیہ تعلق، بادِ نسیم کے خروش اور بہتی ندیوں کی سرسراہٹ میں محدود رکھنے کے خلاف تھے۔ چنانچہ اس رائے کو عملی شکل دینے میں خود اُنھوں نے بھی حصّہ لیا۔ اُنھوں نے الٰہیات اور فلسفہ جیسے "پائے چوبیں" مضامین کے بعض غامض اور "بے تمکین" مگر مہتم بالشان مسائل پر ضربُ الخاتم

---

[1] اِس غازیانہ کارنامے پر ہندوستان کے جن نامور اور مُفلقند شعراء نے مصطفیٰ کمال کو خراجِ عقیدت ادا کیا تھا اُن میں حکیم الامت علامہ محمد اقبال بھی شامل تھے۔ ان کے فارسی کلام میں ان کی ایک مستقل نظم "خطاب بہ مصطفیٰ کمال پاشا ایدہُ اللہ" کے عنوان سے موجود ہے۔ یہ نظم اُنھوں نے جولائی ۱۹۲۲ء میں لکھی ہے۔ اس کے پہلے دو شعر یہ ہیں :-

اُمتے بود کہ ما از اثرِ تربیّت او
واقف از سرّ نہاں خانۂ تقدیر شدیم
اصلِ ما یک شررِ باختہ رنگے بود است
نظرے کرد کہ خورشید جہاں گیر شدیم
نکتۂ عشق فرو شُست زِ دلِ پیرِ حرم
در جہاں خوار باندازہ تقصیر شدیم

علی حدوث العالم" کے نام سے ایک مستقل منظوم رسالہ قلمبند کیا ہے۔ اسی طرح حافظ ابن القیم الجوزی رح کے مشہور قصیدہ نونیۃ الاحاد کے تتبع میں اسلامی عقائد پر ایک نظم لکھی جس میں حدوثِ عالم وغیرہ کی حقیقت پر دلائل قائم کر کے شیخ بو علی سینا کے ارسطا طالیسی فلسفے کی تردید کی۔ جبر و اختیار کے مسئلہ پر بھی اُنہوں نے ایک عمدہ نظم لکھی ہے۔ جسے مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی نے ترجمان السنّہ میں ترجمے کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اُن کی اس قسم کی شاعری سے یہاں نمونے پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے اپنی شائع شدہ کتاب میں مختلف مقامات پر اِس قسم کے نمونے پیش کئے ہیں۔

علاوہ ازیں علّامہ محمد انور شاہ رح کی کچھ مدحیہ نظمیں بھی یادگار ہیں۔ مثلاً علّامہ شوق نیموی رح کی "آثار السنن" کی تعریف و تقریظ میں اُنہوں نے دو قصیدے لکھے ہیں یا ایک نظم نواب حبیب الرحمان خان شروانی کے دار العلوم دیوبند وارد ہونے کے موقعہ پر قلمبند کی ہے۔ مگر اِس قسم کی ساری نظمیں قصیدہ خوانی کے بجائے علمی اور اصلاحی رنگ کی حامل ہیں۔

مولانا سید مبرک شاہ اندرابی کشمیری

حضرتِ مولانا محمد انور شاہ کشمیری رح کے ہموطن شاگردوں میں مولانا مختار اللہ معروف بہ مبرک شاہ اندرابی اپنی علمی قابلیت اور ادبی مہارت و بصیرت میں بڑی شہرت کے مالک تھے۔ وہ دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور بعد میں استاد بھی تھے۔ دیوبند کے علاوہ وہ تبلیغ کالج کرنال میں بھی مدرّس ہوئے تھے۔ تقسیمِ ہند کے بعد جامعہ مدینہ لاہور میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے علمِ حدیث کا درس دینے لگے یہاں تک کہ ۱۹۷۵ء میں اپنی طبعی عمر کو پہنچ کر لاہور میں انتقال کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو

کشمیر کی یاد تڑپاتی تھی اور وطن اور اہلِ وطن کی مہجوری کا شدّت سے احساس تھا اپنی غیر مطبوع اردو اور کشمیری تفسیرِ قرآن میں سورۂ حدید کے آخر پر یہ الفاظ لکھ کر اپنی اندرونی کیفیّت کا اظہار کیا ہے:-

و ذلك ببلدۃ لاهور .... مكفوفاً عن الوطن و محفوفاً بحوادث الزّمن و هجوم الفتن فلقاً لضياع الدّين و ازدهام المحن	یہ تفسیر لاہور میں مکمل ہوئی، اِس حال میں کہ مؤلف وطن سے دور پڑا ہوا ہے، زمانے کے حوادث اور فتنوں کے ہجوم میں گرا ہوا ہے۔ دین کے نقصان اور آزمائشوں کی کثرت سے بے چین ہے۔

مولانا بلند مرتبہ عالمِ دین اور عربی زبان و ادب کے ماہر و متبحّر اُستاد تھے۔ اُنہوں نے کئی چھوٹی بڑی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن میں موطا امام مالک کی شرح بھی شامل ہے جو ابھی تک غیر مطبوع ہے۔ خاکسار کو اُن کی جن دوسری غیر مطبوعہ کتابوں کا سراغ مِلا ہے وہ یہ ہیں:- ۱۔ **مختار التراجم** (قرآن پاک کا کشمیری زبان میں ترجمہ اور اُردو میں تشریحی نوٹس۔ ۲۔ ترجمہ و شرح "**اِکفار الملحدین**" تالیفِ علامہ انور شاہ کشمیری۔ ۳۔ **حیاۃ النبیؐ** (اردو، مختصر مگر نہایت قیمتی علمی رسالہ) ۴۔ **شب** (مسدّس کی شکل میں ایک فارسی نظم[1]۔

عربی شعر و ادب کے موضوع پر ان کی تحریری یادگار "**محیط الدائرۃ**" کی شرح ہے جس کا ذکر آگے مناسب موقع و محل پر آئے گا۔

---

[1] ہندوستان میں عربی شاعری (غیر مطبوعہ)

مولانا میرک شاہ صاحب عربی کے بلند پایہ مگر فطری شاعر نہیں تھے۔ ان کی شاعری آمد سے زیادہ آورد کی نوعیت رکھتی ہے، چونکہ انہیں عربی میں لکھنے اور بولنے پر ماہرانہ عبور اور اُستادانہ دسترس تھی، اس لیے وہ کبھی کبھی شعر کہنے اور شعر لکھنے میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ اگرچہ ان کی عربی شاعری ابھی تک مجموعہ کی شکل میں شائع نہیں ہوئی ہے۔ اور نہ ان کا سارا کلام ایک جگہ میسّر ہے جس سے ان کے کلام کی کمیت کا اندازہ لگ سکتا تاہم اتنا تو یقینی ہے کہ اُنہوں نے اچھی مقدار میں شعر کہے ہیں۔ راقم کو صرف دو رِثائی قصیدے ہی حاصل ہو سکے ہیں جسکہ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں :-

وقد أبكيتُ جمعاً من رجالٍ
يُسمّىٰ جُلّهم باسم الإمام

(میں نے آج تک ایسی بہت سی شخصیتوں پر رویا ہے جن میں سے اکثر "امام" کہلائے جاتے ہیں)

استادِ محترم ڈاکٹر حامد علی خان صاحب نے لکھا ہے کہ مولانا اندرابی نے دو ہزار اشعار کہے ہیں[۱]

احقر مؤلف کے سامنے اس وقت مولانا کے جو دو مراثی موجود ہیں، ان میں سے ایک حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور دوسرا حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی یاد میں

---

[۱] مولانا ممدوح کی یہ ساری غیر مطبوعہ تالیفات اُن کے فرزند مولانا سید نبیہ احمد اندرابی مرحوم نے سرینگر منتقل کی ہیں۔ میں برادر سید وجیہہ احمد صاحب اندرابی اور سید محمد احمد صاحب اندرابی کا شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے اپنے عالیقدر اسلاف کے اس علمی ذخیرہ سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا؛

لکھا گیا ہے ۔ یہ دونوں قصیدے نہایت پُراثر اور دردانگیز ہیں جن میں اصحاب مراثی کے علم و فضل، حفظ و ذہانت اور تقویٰ و طہارت کا نقشہ پوری قادرالکلامی اور علمی وقار کے ساتھ کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ شعرائے عرب بھی اِس زبان دانی پر رشک کر سکتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ مولانا انور شاہ صاحب کا درجہ بلند کرے جنہوں نے اپنے شاگردوں میں مذہبی علوم کے ساتھ عربی لغت و ادب کا شوق و ذوق کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا جس سے عرب دنیا میں علمائے ہند کی مہارتِ شعروادب سے سر اُونچا ہو گیا ۔ مولانا محمد یوسف صاحب بنّوری، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی، مولانا محمد امین صاحب کاملپوری، مفتی محمد شفیع صاحب ۔ وغیرہم عربی شعروادب اور عربیّت کے متبحّر عالم و ماہر تھے اور خود مولانا میرک شاہ صاحب بھی انہی میں شامل ہیں ۔ مولانا اندرابی کو اپنی عربی دانی پر اس قدر اعتماد تھا کہ ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ " دنیا بھر کی زبانوں میں سب سے زیادہ سہل زبان عربی فصیحہ ہے "[۱] جُرجی زیدان نے ایک جگہ لکھا ہے کہ عصرِ حاضر میں ادب میں صنائعِ لفظی اور محسناتِ بدیعی میں کھو جانے کے بجائے حقائق کا کھوج لگانے کی ضرورت ہے " اسی لئے عصرِ جدید کے قلمکار صنائع و بدائع کے بجائے حقائق و واقعات کو سہل انداز و اسلوب میں پیش کرنے کو ترجیح دیتے ہیں ۔ مولانا میرک شاہ اندرابی نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ آج کے ادیبوں میں دراصل ذوق کا فقدان اور صلاحیّت کی کمی ہے جس نے انہیں کشفِ حقائق کی پناہ لینے کا بہانہ ڈھونڈنے پر مجبور کیا[۲] یہاں مولانا کی اِس رائے سے اختلاف کرنے کی گنجائش ضرور موجود ہے مگر اِس سے عربیّت میں ان کا ماہرانہ اور استادانہ درک

---

[۱] اورنٹل کالج میگزین، لاہور : مقالہ : عمرو بن الفارض ۔ فروری ۱۹۵۱ء

[۲] حوالہ سابق ۔

رکھنے کی طرف اشارہ ملتا ہے اور حق یہ ہے کہ اگر ان کی شاعری جمع و ترتیب کے ساتھ عرب دنیا میں متعارف ہو جائے گی تو ان کی عربی دانی کا شایانِ شان طریقے پر اعتراف کیا جائے گا۔ عالی ظرفی علمائے عرب کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

پہلے ہم یہاں اُس مرثیہ سے چند اشعار بطورِ نمونہ درج کرتے ہیں جو اُنہوں نے اپنے استاد (علامہ محمد انور شاہ) کے اِنتقال پر لکھا ہے:۔

سقی اللہ رمسًا فیہ بدرٌ منوّرٌ
أضاءت بہ الآفاق إذ کان یزھرُ

مِنَ الدّیمِ المدرارِ ماذرّ شارق
عھادًا تروّی غیثُہٗ و یخضّرُ

قرارۃ بحر العلم أم رمسُ أنورٍ
قدیسُ محیط القُدس أم ھُو جوھرٌ

واجبی قلوبًا بالمعارفِ والحجیٰ
کاحیاءِ وسمّی ریاضًا تنضّرُ

کریمٌ اذا ما زُرتَہٗ زُرتَ ذاخرًا
لہٗ دُرُّ عرفانٍ یموجُ و ینثرُ

محدّثُ عصرٍ ما أتی بمثیلِہٖ
و بحرٌ بفضّم للعلوم و مصدرٌ

وإن جئتہٗ ترتاد نقلَ مسائلٍ
تجد موجَ بحرٍ عنبہٖ فام یزخرُ

(اللہ تعالیٰ اس قبر کو سیراب کرے جس میں ایک چمکتا ہوا ماہ کامل موجود ہے، جو جب

تک زمین کی سطح پر چمکتا رہا، اطراف واکناف کو منوّر رکھا۔ خدا اِس قبر کو موسلا دار بارش سے تب تک سیراب کرتا رہے جب تک آسمان پر آفتاب چمکتا رہے اور ہر بہار کی بارش اس کو سرسبز و شاداب رکھے۔ میں اسے کس نام سے پکاروں! کیا اِسے علم کا پُرسکوں سمندر کہوں یا خس و خاشاک سے پاک سمندر کا موتی کہوں، کیا اُسے جوہرِ قابل سے یاد کروں یا ایسی خوابگاہ کہوں جو تاباں و درخشاں ہے۔ وہ ایک زمانے تک سطح زمین کو چمکاتا رہا اور اب حال یہ ہے کہ اندرونِ زمین کو روشن اور منوّر کئے ہوئے ہے۔ اِس نے اپنی مومنانہ فراست اور فیضانِ علم سے لوگوں کے دلوں کو زندگی بخشی جس طرح موسمِ بہار کی پہلی بارش باغوں کو سرسبز کرتے ہوئے زندہ کردیتی ہے۔ ان کا فیض اِس طرح عام تھا کہ اگر تم اس کی ملاقات کرتے تو ایک ایسا سمندر پاتے جو علم و عرفاں کے موتیوں سے مالامال تھا اور موجیں مارتا تھا۔ وہ اپنے زمانے کا بے مثال محدّث اور علوم کا بحرِ ناپید کنارہ جس سے ہر تشنہ لب سیراب ہوتا تھا۔ علمی مسائل پر معلومات نقل کرتے وقت اگر تم اُس کے پاس ہوتے تو اُسے ایسے سمندر کی شکل میں دیکھتے جس کی لہریں ٹکراتی ہوں)۔

ایسے مایۂ نازِ عالم کے انتقال سے علمأ اور طلبأ، علم کو جو نقصان پہنچ سکتا ہے اور جو صدمہ علم اور علمأ کے پرستاروں کے دِلوں پر ڈال سکتا ہے، اس کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے، کہتے ہیں:۔

فیا عینُ بکّی شرقَ شمس وغربِها
وجُودی بدمعٍ سَیْلُهُ متواترٌ
أبعدَ دفینٍ بالمصلّی بری الورىٰ
جبالُ علومٍ سُوْلُهُم ابنُ أنْوَرٍ

فضیت اُموراً کان صَعْباً منالها
فذللت لك الصُعْباتُ والصّعب البسر
فیا فخر هندٍ ثمہ دیوبند مرقداً
یباھی بك الکشمیر تمت شرور[1]

(پس اے آنکھ! تو ایسے آفتاب کے طلوع و غروب پر دل کھول کر رو اور ایسے آنسو بہا جس کا تسلسل کبھی نہ ٹوٹے۔ کیا اب یہ ممکن ہے کہ اسے دفن کرنے کے بعد دنیا پھر اسے دیکھ سکے گی؟ علم کے بڑے بڑے پہاڑ اب پوچھا کریں گے کہ اب انور شاہ کو کہاں سے لائیں؟ تو نے ایسے پیچیدہ مسائل کو حل کیا جن کا حل بے حد کٹھن تھا۔ اس طرح دشواریاں تیری تابعدار بن گئی تھیں اور سختیاں تیرے لئے آسان ہو گئی تھیں۔ بس اے ہندوستان کے مایہ ناز فرزند جس کی آخری خوابگاہ دیوبند ٹھہری، تم پر کشمیر بشمولِ تروره فخر و ناز کرتے رہیں گے۔)

مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رح ہندوستان کی تحریک آزادی کے نامور مجاہد اور ملتِ اسلامیہ کے ایک اہم ستون تھے۔ حضرت مولانا مدنی اور مولانا میرک شاہ اندرابی دو مختلف سیاسی نظریات رکھتے تھے۔ اول الذکر دو قومی نظریہ کے سخت مخالف اور متحدہ قومیت کے علمبردار تھے جبکہ میرک شاہ صاحب تحریکِ پاکستان کے حامی تھے اور تقسیم کے فوراً بعد پاکستان ہجرت کر کے وہیں دائمی سکونت اختیار کی، تاہم مذہبی اور فکری اعتبار سے دونوں کا تعلق ایک ہی سرچشمے سے تھا، ہماری مراد دیوبندی مسلک و مشرب سے ہے جس کے آگے

---

[1] نفحۃ العنبر مِن ھدی الشیخ الانور: ص ۲۰۶ تا ۲۰۷

علمائے دیوبند نے اپنے سیاسی اختلافات کو کبھی غیر معمولی اہمیت نہیں دی، اگرچہ ہر ایک عالم اپنے اپنے موقف پر ڈٹا بھی رہا۔ اِس لئے مولانا میرک شاہ مرحوم کیلئے یہ قطعاً ناممکن تھا کہ حضرت مدنیؒ کے اِنتقال پر وہ غیر متاثر رہتے جبکہ وہ دیوبند میں ان کے اساتذہ کی صف کے بزرگ تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے پاکستان ہی میں ان پر ماتم کیا اور (۷۶) اشعار پر مشتمل ایک عمدہ مرثیہ لکھا جسے انہی دنوں الجمعیتہ دہلی نے مولانا مدنی نمبر میں شاملِ اشاعت کیا اور مرثیۃ الشیخ الأجل ... ...من حضرت الاستاذ مولانا میرك شاہ اندرابی رئیسُ جمعیّۃ الأوقاف فی منطقۃ پنجاب (پاکستان) کے عنوان کے تحت نقل کیا۔

مرثیہ کے ابتدائی سترہ اشعروں میں مولانا مدنی کے علم و فضل، سیاسی خدمات، ورع و تقویٰ، ملی غیرت، مذہبی حمیّت، اعلیٰ اخلاق، پاکیزہ کردار، عالی ظرفی، بلند حوصلگی، روحانی بصیرت اور ایمانی فراست کا ذکر کیا ہے جو یقیناً مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کے تابناک خد و خال تھے اور شاعر نے اِس دورِ قحط الرّجال میں ایسے عظیم و جلیل بزرگ کے اُٹھ جانے پر کفِ افسوس ملا ہے۔ یہاں اِس مرثیہ کے اِبتدائی چند اشعار پہلے پیش کئے جاتے ہیں :۔

أراب القلب ابناءُ أتتنَا

بأبعادِ الدّواھی و اغتنام

و اقلاقِ و ایلامِ و حُزنٍ

و افراغٍ و تخریبِ المنام

وَ إيحاشٍ وَ ادهاشٍ وَ هَمٍّ
وَاسهارٍ قرينٍ بالحمام
الا يا عين بكّي اِذرُ زئنا
كريمًا سيّدًا رأس الانام
امامًا هادیًا قمرًا منيرًا
مزيحًا نورُہٗ ظلم الظّلام

(میرے دِل کو اِن خبروں نے ششدر اور پریشان کر دیا جو مصائب کے پلٹ پلٹ کر آنے کے بارے میں ہمارے پاس پہنچتی ہیں جو ہمیں اضطراب، درد و غم، رنج و حزن، تردّد و تذبذب، اضطراب و بے خوابی، وحشت انگیزی، یاس و حرماں اور موت کی سی بے بسی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ میری آنکھ! آج ایک بار پھر تو آنسو بہا، کیونکہ آج ہمیں ایک عظیم انسان کے رخصت ہو جانے کی مصیبت پہنچائی گئی جو پیشواؤں کا پیشوا اور ہمارا مقتدیٰ و راہنما تھا، جو ایک چمکتے ہوئے چاند کے مانند تھا جس کی تابانی سے تاریکیاں چھٹ جاتی تھیں)۔

اِس کے بعد کھلے دِل سے مولانا مدنیؒ کے اوصاف و کمالات بیان کر کے اِن کی رفعتوں کا اعتراف کیا ہے۔ آخر پر کچھ پُراثر اور حکیمانہ خیالات کا اظہار کیا ہے اور قانونِ قدرت کے آگے مخلوقات کی بے بسی کا اقرار اور خالقِ کائنات کے آگے تسلیم و رضا کا سر خم کرنے کی ترغیب دی ہے اور اسی کو بے قرار دِل کو قرار پہنچانے کے لئے اصلی دوا قرار دیا ہے۔ سہل و سلیس الفاظ میں حکیمانہ خیالات کا کچھ اس طرح ذکر کرتے ہیں کہ ابوالعتاہیہ یاد آتے ہیں:

سبیل الموت منهاج البرایا
مآل العیش عین الاحترام
خلودُ المرءِ لَمْ یُسمع قدیمًا
ولا مولُودٌ باقٍ للدّ وام
ولا مخلوقٌ الا سوف یفنیٰ
ویبقیٰ وَجہُہُ خالقنا السّلام
ومَنْ ابقیٰ بقایا صالحات
فماذا الدّارُ اِلّا لِانہدام[1]

(موت کا راستہ تمام مخلوقات کے لئے ایک طے شدہ راستہ ہے اور زندگی کا منتہٰی و مرکز عزّت و احترام ہے۔ یہ کبھی سُننے میں نہیں آیا ہے کہ انسان کو دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے بلکہ جو بھی کوئی دنیا میں پیدا ہوا ہے اِس کے لئے دوام نہیں ہے۔ ہر ایک مخلوق کو مقررہ وقت پر فنا ہونا ہے۔ بقا صرف اللہ کی ذاتِ پاک کے ساتھ مخصوص ہے۔ ہاں جس شخص نے اپنے پیچھے نیک اعمال چھوڑ دئیے اس کے لئے فنا ہی میں بقا ہے۔ پس اے مختار ہمت اور صبر سے کام لے یہ ساری دُنیا مُنہدم ہونے کے لئے ہی ہے)

مولانا مبرک شاہ صاحبؒ فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ اُنکے تحریری سرمائے میں احقر کو ۳۶ بندوں پر مُشتمل ایک مسدّس بھی دیکھنے کو ملا جس کا عنوان "شب" ہے، یہ نہ صرف "رات" سے متعلق قیمتی معلومات کا گنجینہ ہے، بلکہ مولانا نے بات سے بات نکال کر اپنی ذہانت و فطانت کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔

---

[1] الجمعیتہ شیخ الاسلام نمبر، طبع دوم۔ گجرانوالہ لاہور ۱۹۸۵ء

ہم اس کا پہلا اور آخری بند یہاں نقل کرتے ہیں :۔

دانہ دانہ نور لرزاں چشمہ چشمہ برقِ طور
بحرِ ظُلمت خرمنِ لولوئے لالہ رشکِ حُور
"چشم وا" و باہزاراں چشم تاباں نیز کور
خامُش و خاموش ساز بزمِ نسوان و ذکور
بے چراغ و با چراغانِ زمین و آسمان
لیلئے شب یا شۂ سوداں برنگِ زنگیاں

اختتام اس بند پر ہوا ہے :۔

مرد قیلولہ بنظمِ شب شفق خارج کند
پنج و رُبعے بہر خواب و بہرِ یقظہ مے برد
یا بخیزد سہ و نیمے ہفت در خواب کشد
یا سہِ نیمے خفتہ باشد ہفت قائم مے شود
خوابِ شیریں اہلِ حکمت را قضائے حاجتی
شب برائے یقظہ باشد بس ہمایوں فرصتے

مولانا نے اس مسدس کے آخر پر یہ نوٹ قلمبند کیا ہے :۔

" اپریل ۱۹۴۷ء / ۱۳۶۶ھ (بمقام لاہور) تقریباً ۸ دن تک کرفیو کی وجہ سے جب گھر سے نکلنا اور کسی کا ہم سے ملنے کے لیے آنا جبراً ممنوع ہوا تو یہ نظم اسی تخلیہ میں لکھی گئی۔"
—— مختار اللہ المعروف میرک شاہ اندرابی۔

مندرجہ بالا شعراء کے علاوہ کشمیر کی مردم خیز زمین سے اور بھی کئی شعراء اُٹھے ہیں جنہوں نے عربی نثر و نظم میں بہت کچھ لکھا ہے مگر بد قسمتی سے ان کا اکثر تحریری سرمایہ یا تو ضائع ہوا ہے یا گوشۂ گمنامی میں پڑا ہے۔ بارہویں صدی ہجری کے ایک نامور عالم مُلّا محمد اشرف عربی اور فارسی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے، انہوں نے اپنے ہموطن اُستاد مولانا عبدالشکور (۱۱۱۳ھ) کی وفات پر ایک مرثیہ لکھا تھا جس کا تا حال راقم کو سراغ نہ مل سکا۔ بعض علمأ فن غیر منقوطہ میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے، تعود مؤرخ اعظمی بھی اِن میں شامل تھے۔ اپنے اُستاد و مُربی شیخ مُراد نقشبندیؒ کے اِنتقال کا ذکر کرتے ہوئے مؤرخ مذکور لکھتے ہیں:۔

"تاریخ وصال آں مقبولِ ذوی الجلال بعض یاراں نظم و نثر گفت فقیر حقیر بہ تبعیت آثار ... ... تاریخ موزوں و منثور عربی و فارسی با نقطہ و بے نقطہ فکر کردہ و ہمہ آنرا در رسالہ فیض مراد آوردہ۔"[1]

بعض علمائے نے کئی اہم عربی قصائد کو فارسی نظم کا جامہ پہنایا، اِن میں قصیدہ خُمریہ قادریہ، قصیدہ بانت سُعاد اور قصیدۂ بردہ (بوصیری) خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اِن مترجمین میں مرزا اکمل الدین خان بدخشی (صاحب بحر العرفان فارسی) اور شیخ محمد بن نعیم تارہ بلی (برادرِ اصغر شیخ احمد تارہ بلی رحمۃ اللہ علیہ کے تراجم مشہور ہوئے۔ شیخ محمد تارہ بلی نے اپنے ترجمے کی ابتداء اِس

---

[1] تاریخِ اعظمی: ص: ۲۴۳

طرح کی ہے:-

کرد جرأت اسیرِ نفسِ ذمیم
غرقِ عصیاں محمد ابنِ نعیم
تا بشرحِ قصیدۂ بُردہ
خویش را درمیانہ آوردہ
گرچہ منظوم کرد مفہومش
ہیچ تغیرے نہ بود معلومش
عمرِ خود صرف در لطافت کرد
اینقدر نیز از جہالت کرد

تراجم کے ضمن میں وردالمریدین کے عربی ترجمہ تاج العارفین کا ذکر کرنا بھی ناگزیر ہے۔

عہدِ مغلیہ کے ایک جلیل القدر کشمیری عالم علامہ داؤد خاکی (م ۹۹۴ھ) کی تصانیف میں ایک منظوم فارسی رسالہ 'وردالمریدین' علمی اور ادبی (بلکہ بعض بزرگوں کے نزدیک روحانی) اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ کشمیر کے اس نامور عالم اور بزرگ نے اس رسالے میں اپنے مُرشدِ نامدار حضرتِ حمزہ مخدومؒ کے حالات اور روحانی کمالات والہانہ انداز میں بیان کئے ہیں، یہ رسالہ اصل میں "۳۶۳" اشعار پر مشتمل ہے[۱] خاکسار مؤلف کے والدِ محترم (مولانا سید قاسم صاحب بخاری مدظلہٗ العالی) نے اس پورے رسالے کو عربی نظم میں منتقل کیا ہے۔

[۱] اکثر اہلِ علم اشعار کی تعداد زیادہ بتاتے ہیں جو ان کی رائے میں ضائع ہوئے ہیں جبکہ بعض اہلِ تحقیق نقصان و اتلاف کے قائل نہیں ہیں۔

جس کا نصف حصّہ اردو شرح و ترجمہ کے ساتھ شائع بھی ہو چکا ہے۔ دورِ جدید میں ایسے ترجموں میں الفاظ کی پیروی کے بجائے مفہوم کی ادائگی پر نگاہ رہتی ہے۔
شیخ عبدالوہاب عزّام نے علاّمہ محمد اقبالؒ کی منظوم تصانیف کو عربی میں منتقل کرنے کے دوران اسی چیز کا زیادہ خیال رکھا ہے اور علامہ اقبال کے الفاظ کی پیروی کے بجائے اُس کے مفہوم کو نہایت فصیح و بلیغ تراکیب کے ساتھ عربی میں پیش کیا ہے۔
یہی حال اُن عربی مترجمین کا بھی ہے جنہوں نے خیّام، حافظ اور مولانا جلال الدین رومیؒ کا فارسی کلام عربی میں منتقل کیا ہے۔ اِس سے ایک طرف مُترجم مختلف بندشوں سے آزاد ہوتا ہے۔ اور دوسری طرف مصنّف کے مفہوم و مدّعا کو زیادہ سے زیادہ حسین اور بلیغ صورت میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اِس کے برعکس بعض مترجم حضرات متن کے ساتھ احتیاط اور اِعتنا برتنے میں زیادہ حسّاس ہوتے ہیں اور مدّعا و مفہوم سے زیادہ عروض و قوافی کی پابندی کا لحاظ رکھتے ہیں۔
پھر جب اصل کتاب تصوّف جیسے مضمون کے فکری اور وارداتی مسائل نیز اِس فن کی اصطلاحات اور تلمیحات سے لبریز ہو تو اُسے دوسری زبان میں منتقل کرنے کے لئے ترجمے کا یہی راستہ اختیار کرنا مناسب اور موافق ہوتا ہے۔ اِس میں مترجم اپنی آزادی قربان کرنے کو ترجیح دیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ وہ مصنّف یا شاعر کی تحقیقات دوسروں کی طرف بلا کم و کاست منتقل کرے۔
اُستادِ محترم پروفیسر محی الدین صاحب حاجنی (سابق صدر شعبۂ عربی، الیس، پی کالج سرینگر) نے احقر کو ایک مرتبہ درس کے دوران اِس قسم کے ترجمے کو زیادہ مُشکل اور ریاض طلب کہا تھا۔ زیرِ بحث ترجمہ اسی دوسری رنگ و آہنگ کا حامل ہے۔ ہم یہاں متن اور ترجمے سے چند اشعار بطورِ نمونہ درج کرتے ہیں:۔

فارسی: شکر للہ حالِ من ہر لحظہ نیکو تر شد است
بشیخِ شیخاں بشیخ حمزہ تا مرا رہبر شد است

عربی: شکر ربی صار حالی کلّ حینٍ مُثمرا
مذ ھدانی بشیخ الشیوخ شیخ حمزہ مؤثرا

فارسی: آفتابِ عالمِ ارشاد و تکمیل است ولیک
ناقص از نقصانِ خود خفّاشِ وش اعور شد است

عربی: شمسِ ارشادٍ و تکمیلٍ ھو فی العالم
والبلید صار عنہُ کالخفاش اعورلی

فارسی: بہرِ اثباتِ نسب از روضۂ پاکِ نبیؐ
از جوابِ یا ولد مخصوص در محضر شد است

عربی: اِنّہٗ من روضۃ طٰہٰ لِاثباتِ النّسب
نال فضل یا بُنَیّ فی الجواب محضرا

فارسی: خطۂ پاکِ زمینِ اُچہ در ہندوستان
از صفائے مرقدش بازینت و بافر شد است

عربی: قطعة من ارض قدسٍ اُچّہٗ فی ملک ھند
قد تناھت لاجل جدثہٖ حبرۃ ومنظرا

اصل کو چھوڑ کر صرف ترجمے کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں:۔
اِنّہٗ نال السّموّ مع عمّ المصطفیٰ
حمزۃ کان شدیداً فی الجھاد مجد

قد تمنّیٰ والّذین جاھدو ثمّ سعیٰ
فالالٰہُ ساقہ للتخلق طرّاً منزرا

معضلات واردات السالکینَ عندہٗ
شی جھا قد صار جدّاً للمریدین الیسرا

حفظُ نفسٍ فی التخلّی ما التجلّی شانُہٗ
وھو مولائی وھادی باطناً مع ظاھرا

یہاں پہ یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس ترجمے کا کلاسیکی عربی زبان و ادب ہی کی روشنی میں مطالعہ کرنا چاہیئے۔ جدید عربی لٹریچر خصوصاً عربی دارجہ میں بہت سے الفاظ کے وہ معنی باقی نہیں رہے ہیں جو

پہلے متعیّن اور معروف تھے یہ بات ذہن میں رہے تو مولوی قسم کے مسٹر اور مسٹر قسم کے مولوی اِس سے یکساں طور پر مستفید ہو سکتے ہیں۔ اس کے باوجود ہمیں اعتراف ہے کہ عرب، عرب ہیں اور عجم، عجم! اہل زبان بالخصوص طبقۂ علماء اور شعراء کے لئے اِس ترجمے میں اگر جھومنے کا سامان نہیں ملے گا، تو اِس پر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے، تاہم اِس ترجمے کے پیچھے جو عقیدت اور خلوص کارفرما ہے اس کا اعتراف بھی اُن کے سوا کوئی نہیں کرسکتا، اہلِ عرب کی عالی ظرفی مسلم ہے۔

علماءِ کشمیر کی تالیفات، تراجم اور شروح

کشمیر میں عربی زبان وادب کے فنون پر معمولی درجے کا کام ہوا ہے۔ چونکہ یہاں ہر دور میں مذہبی اور روحانی مزاج اور مذاق ہی غالب رہا اس لیے علماء کشمیر نے زیادہ خدمات بھی انہی میدانوں میں انجام دی ہیں۔ تاہم اس کا یہ معنیٰ نہیں ہے کہ فنونِ ادبیہ میں علماءِ کشمیر کا مرتبہ بلند نہیں تھا۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ انہوں نے اِن فنوں میں اپنی صلاحیتیں صرف درس و تدریس تک محدود رکھیں۔ ہم نے گزشتہ صفحات میں شیخ رضی الدین، مُلّا بصیر، محمد بن ابی محمد، خواجہ علی پنّو، مُلّا محمد محسن کھشو، خواجہ محمد ٹوپیگرو وغیرہ کے بارے ہمیں لکھا کہ وہ صرف و نحو، بیان و بدیع اور عربیّت کے ماہر اساتذہ تھے اور اپنے اپنے وقت میں طلبائے علم کے لئے اِن علوم میں مرکز و محور بنے ہوئے تھے۔ اور حق یہ ہے کہ پورے ہندوستان کا یہی حال رہا ہے۔ درس و تقریر کے اعتبار سے علماءِ ہند کسی بھی فن میں پیچھے نہیں تھے۔ مگر تحریری طور فقہ اور منطق اور آخر میں علم حدیث اِن کے خاص تحقیقی مضامین رہے ہیں۔

مولانا حکیم سید عبدالحی حَسنی مرحوم ادب و اِنشا میں علماءِ ہند کے تحقیقی کارناموں پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

امّا اهل الهند فانهم لیسوا من هذا العلم فی ورد ولا صدر ونخل	جہاں تک اِس فن میں ہندوستانی علماءُ کا تعلّق ہے تو وہ اِس وادی میں بالکل اجنبی رہے ہیں اور اس میں اِن کا

لہم بوادیہ و لا سد رہ[1] کوئی خاص حصہ نہیں رہا ہے۔

اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلام کا ورود خراسان اور ماوراء النہر کی جانب سے ہوا، ان ممالک کے رہنے والوں پر فنونِ عقلیہ کا غلبہ تھا چنانچہ علماءِ ہند نے بھی انہی علوم و فنون کو اپنایا۔ فقہ، اصولِ فقہ، کلام اور لغت جیسے علوم ماوراءالنہر سے تعلق رکھنے والے علماء کی بدولت داخل ہوئے[2] جب یہ حالت ہندوستان کے علماء کے بارے میں تھی تو کشمیر کا حال کسی وضاحت کا محتاج نہیں ہے۔ جہاں اسلامی علوم و فنون کی عمر سات سو سال سے زائد نہیں ہے۔ خاکسار مؤلف کو شروح و حواشی یا تراجم و تعلیقات کی شکل میں جن کتابوں سراغ مل سکا ان کی تفصیل درج ذیل ہے اور حق یہ ہے کہ ان سے عربی لٹریچر میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے۔

عروض، بیان اور بدیع

شرح مطول: مُلا نورالدین علامہ سعدالدین تفتازانی کی تصنیف مختصر المعانی کو ہمارے عربی مدارس میں صدہا سال سے بڑی مقبولیت اور اہمیت حاصل رہی ہے اس کے بعد مطول کا نمبر آتا ہے جو عربی بلاغت اور معانی سمجھنے کے لئے کلیدی اہمیت کی حامل ہے۔ اس پر کثرت سے شرحیں اور حواشی لکھی گئی ہیں۔ ان حواشی نگاروں میں علمائے کشمیر کا بھی حصہ رہا ہے مولانا نورالدین یا مُلا نوراللہ کنتھ بھی ان میں شامل ہیں انہوں نے وقت کے اکابر علماء جیسے مولانا عبدالسلام کشمیری (تلمیذ رشید مولانا امان اللہ شہید کشمیری)، مُلا حسام الدین اور قاضی مبارک گوپاموی وغیرہ

---

[1] الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند: ص ۴۴

[2] الثقافۃ الاسلامیہ : ص ۴۴

سے دینی، ادبی اور فکری علوم کی تحصیل کی۔ روحانی تربیت حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ سے پائی۔ مُلّا صاحب کا انتقال (۳ ربیع الاول ۱۱۹۲ھ) کو ہوا اور سر ہنگر کے مشہور مقبرہ بہاء الدین گنج بخش میں محوِ خواب ابدی ہیں[1]۔

مُلّا صاحب نے مختلف موضوعات پر چار تحریری یادگار چھوڑ دی ہیں جن میں ۲ کا کا تعلق فنونِ ادبیہ سے ہے، جو یہ ہیں:-

۱۔ حاشیہ علی شرح الجامی

۲۔ حاشیہ علی المطوّل

دونوں حواشی کا ذکر ڈاکٹر زبید احمد صاحب نے اپنی کتابیات کے لسانیات (PHILOLOGY) کے باب میں کیا ہے[2]۔ یہ حاشیہ شاید مکمل نہیں ہے کیونکہ رامپور میں اس کا جو نسخہ موجود ہے وہ صرف فنِ ثالث تک محدود ہے[3]۔

حاشیہ علی المطوّل: مُلّا محمد محسن کھشو گزشتہ صفحات میں ہم نے ان کے علم وفضل اور درسی و تحریری خدمات کی طرف کئی جگہ ضمناً ذکر کیا ہے۔ انہوں نے بھی مطوّل پر حاشیہ لکھا تھا جو اب دستیاب نہیں ہے۔ علامہ ابو القاسم جار اللہ زمخشری کی مشہور تفسیر کشاف پر بھی انہوں نے حاشیہ لکھا، یہ تفسیر، جیسا کہ اہلِ علم پر مخفی نہیں ہے قرآنِ حکیم کے ادبی اعجاز کی شرح اور "عربی مبین" کی وضاحت ہی سے مخصوص ہے اور محض اسی اعتبار سے معتبر سمجھی جاتی ہے۔

---

[1] تاریخِ حسن: ج ۳: تذکرۂ علماء ہند: مولوی رحمان علی: ص ۲۴۸، نولکشور ۱۹۱۴ء

[2] THE CONTRIBUTION OF INDIA TO ARABIC LITERATURE : P 563

[3] فہرستِ کتب خانۂ رامپور، نمبر ۵۶۳

کشّاف پر اپنی تعلیقات کی طرف اُنہوں نے خود ہی اپنی ایک دوسری کتاب میں اشارہ کیا ہے۔ ایک جگہ علاّمہ مدخطبّالیؒ کی تغلیط کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"وقالَ الفاضل الخطّابی مِن اَنّہٗ جوّزَ صاحبِ الکشّاف کِلا ۲ الأمریْن، فخطاءٌ صریحٌ و نفضبلہٗ فی تعلیقاتنا علی التفسیرِ[۱]"

حاشیہ محیط الدائرۃ : مولانا میرک شاہ اندرابی ہم نے عربی شعراء اور شعراء کے باب میں مولانا کے حالات بیان کئے ہیں۔ عروض میں ان کی علمی یادگار "محیط الدائرۃ" کی عربی شرح ہے۔

"محیط الدائرۃ فی علم العروض والقافیہ" فن عروض پر لکھی ہوئی کتابوں میں اہم اور متداول ہے جو ایک عیسائی مؤلف کا علمی کرشمہ ہے، اس کی عبارت میں خاصا ایجاز ہے جبکہ فن بجائے خود "خشک" مانا جاتا ہے۔ مولانا میرک شاہ نے اسی اجمال واختصار کو دور کرنے اور اس کے معانی و مطالب کے سہل اور آسان طریقے پر ذہن نشین کرانے کے لئے یہ حاشیہ اور شرح قلمبند کی۔ آج تک اِس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ کتاب کے سرورق پر یہ الفاظ مندرج ہیں:۔ "الفاضل اللوذعی والبارع الألمعی الأدیب والحسیب اللبیب مولانا السیّد مختار اللہ المدعو بمیرک شاہ الکشمیری مدرّس بدارالعلوم الدیوبندیۃ"

---

[۱] شرح عین العلم (قلمی) نسخہ ریسرچ لائبریری۔ سرینگر

رسالہ کے آخر پر مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ (سابق مفتی اعظم پاکستان) کی تقریظ ہے جس سے یہاں چند الفاظ نقل کئے جاتے ہیں :-

"کانت الرسالة المسمّاة بمحیط الدائرة محیطةً لجمیع مباحثه باحسن وجهٍ و اتمّ تفصیلٍ بید انّها کانت محتاجةً الی حل المغلقات و شرحِ المبهمات فالتمستُ لِأجلیه أخی فی الله مولانا السیّد مختار الله المدعو بمبارک شاه الکشمیری المدرّس بدار العلوم الدیوبندیة فلبّی مع مابه مِنَ المشاغل والذ و اهل فعلّق علیه تعلیقاً حسناً"[1]

علم عروض پر محیط الدائرۃ کے نام سے ایک معروف اور متداول رسالہ موجود ہے جو عمدہ اسلوب اور اچھی وضاحت کے ساتھ تمام مباحث پر مشتمل ہے اس کے باوجود اس کے مُغلقات اور مُشکل مباحث تفصیل و وضاحت کے محتاج تھے۔ اس کے لئے میں نے اخی فی اللہ مولانا مبرک شاہ کشمیری مدرس دار العلوم دیوبند سے استدعا کی۔ اُنہوں نے مشاغل اور مصروفیات کے باوجود میری گزارش مان لی اور رسالہ پر عمدہ تعلیقات لکھے۔"

اِن تعلیقات و حواشی سے کتاب کی ضخامت تگنی ہوگئی ہے۔ تقریباً کوئی لفظ محتاجِ وضاحت نہیں رہا ہے۔ فنِ عروض کے اکابر علماء جیسے خلیل، سکاکی، اخفش، دمیانی، صبح جانی وغیرہ کے حوالات دئیے ہیں۔ اِسی حاشیہ سے اندازہ ہوتا

---

[1] محیط الدائرۃ، کتب خانہ رحیمیہ : ص ۲۴۸

کہ مولانا موصوف کو عربی زبان و بیان سے کتنی گہری مناسبت تھی۔ بعض مقامات پر اُنہوں نے مؤلف کے تسامحات سے بھی پردہ اُٹھایا ہے۔

رسالہ در بیانِ عروض و قافیہ : مرزا اکبر کشمیری۔ یہ رسالہ ایک مبسوط مجموعۂ رسائل کا حصّہ ہے، جس کا ذکر آگے آئے گا۔ اِسی مجموعے میں عروض و قافیہ کے مبادیات پر بھی ایک مختصر رسالہ موجود ہے۔ جس میں مؤلف نے پہلے عروض کی وجہ تسمیہ اور اس کے واضع خلیل بن احمد الفراہیدی کا اجمالی تعارف پیش کیا ہے۔ اِس کے بعد عروض کے اغراض و مقاصد، اس کے ارکان و اصول اور بحور و زحافات کو پورے شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ مصنّف کی خاص توجہ فارسی پر مرکوز رہی ہے مگر اِس کے باوجود وہ اس میں عربی تالیفات اور اُئمۂ بلاغت کے حوالجات سے بے نیاز نہیں رہے ہیں۔ مثلاً فاصلۂ کبریٰ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ پنج حرفی کلمہ ہوتا ہے جس کے پہلے حروف متحرک اور پانچواں ساکن ہوتا ہے، جیسے شکنمش، یہ فارسی میں نہیں آتا ہے۔ محمد بن عیسیٰ خوارزمی نے اصولِ مرقومہ کی تائید میں عربی میں بھی اِسی لفظ کو بطورِ مثال پیش کیا ہے"۔ زحافات کی لغوی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ، زُحف لغت میں اصل سے دور ہونے کو کہتے ہیں۔ وہ تیر جو دور جا پڑے عرب اُسے سَہمُ الزاحف کہتے ہیں۔ اِس کی جمع زِحاف، ازاحیف اور زحافات آتے ہیں۔" زحافات پر بحث کرتے ہوئے فارسی اور عربی دونوں کا لحاظ رکھا ہے کہ کس میں کتنے آتے ہیں۔ کون کس سے مخصوص، اور کون مشترک ہے۔ اِسی طرح "بحور و اوزان" کی بحث بھی محیط ہے۔

تراجم کُتب عربیہ

الف لیلۃ ولیلہ : پروفیسر محی الدین حاجنی

اُستادِ محترم پروفیسر محی الدین حاجنی صاحب علامہ عبدالعزیز المیمنی راجکوٹی (سابق صدر شعبۂ عربی مُسلم یونیورسٹی علیگڑھ) کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ تیس سال سے زیادہ مدّت تک کشمیر میں عربی زبان و ادب کے مشہور اُستاد کی حیثیت سے خدمات انجام دی ہیں۔ زندگی کا اکثر و بیشتر حصّہ کشمیری لٹریچر کو مالامال کرنے میں صرف کیا، عربی سے متعلق اِن کی دو یادگار ہیں۔

۱- الف لیلۃ ولیلۃ کا کشمیری ترجمہ: حاجنی صاحب کو کچھ مدّت قید خانے میں گزارنی پڑی۔ اسی مدّتِ اسارت میں اُنہوں نے عربی ادب کی مشہور اور مقبول کتاب الف لیلۃ ولیلۃ کی چند لمبی کہانیوں کا انتخاب کر کے فصیح کشمیری زبان میں ترجمہ کیا۔ اِس طرح اِس عالمی شہرت یافتہ کتاب سے اپنی مادری زبان جاننے والوں کو آشنا کیا اور ساتھ ہی اس کے متعدد تراجم میں ایک اور ترجمے کا اضافہ کیا۔ یہ ترجمہ ریاست جموں و کشمیر کی کلچرل اکادمی کے اہتمام سے ایک ضخیم جلد کی صورت میں کتابت و طباعت کی پوری حُسن و خوبی کے ساتھ منصۂ شہود پر آیا۔

"منہاج الادب" اس کا ذکر آگے منتخبات میں آئے گا۔

ترجمۂ مقاماتِ ہمدانی : مولانا محمد یوسف صاحب

ہمارے دینی مدارس کے فارغ التحصیل علماء میں بعض اساتذہ کو عربی ادب کی جن قدیم کتابوں کے ساتھ

دلچسپی رہی ہے۔ ان میں مبرد کی الکامل اور الحریری اور الھمذانی کے مقامات شامل ہیں۔ کشمیر کے سابق میر واعظ مولانا محمد یوسف شاہ صاحب مرحوم بھی انہی اساتذہ میں ایک تھے۔ وہ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل، مولانا میرک شاہ صاحب کے خواجہ تاش اور مدرسۂ نصرۃ الاسلام کے صدر مدرس تھے۔ اس کتاب کے حصۂ اوّل میں ہم نے اُن کے کچھ عربی رسائل کا، جن کا مذہبی لٹریچر سے تعلق ہے، تذکرہ کیا ہے۔ اُنہوں نے بدیع الزمان الھمذانی کے مقامات کا اردو میں ترجمے کا کام شروع کیا تھا۔ راقم کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ ترجمہ مکمل بھی ہوا تھا یا نہیں، البتہ ایک مقامہ کا سلیس اور بامحاورہ اردو ترجمہ اورنٹل کالج میگزین لاہور میں شائع ہوا تھا۔ اس میگزین کے مرتب اُس وقت کے برصغیر کے نامور فاضل اور محقق پروفیسر مولوی محمد شفیع لاہوری مرحوم تھے۔ اُنہوں نے اس ترجمے کے شروع میں چند تعارفی الفاظ لکھے ہیں، جو یہاں بعینہٖ نقل کئے جاتے ہیں:۔

"ذیل کا ترجمہ عربی ظرافت کے نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، مولوی محمد یوسف صاحب (مولوی فاضل) صدر مدرس مدرسہ دینیہ عربیہ سری نگر نے میری درخواست پر اس مقامہ کا ترجمہ عربی سے کیا ہے۔"[1]

ترجمہ علامة العلامہ: مولوی محمد علی کشمیری ۔ مولوی محمد علی کا تعلق مغل دور سے تھا۔ پہلے کشمیر کے علماء سے کسبِ علم کیا اس کے بعد دکن وارد ہوئے اور احمد نگر میں قیام کیا، سعادت خان کے دربار میں داخل ہو کر بہت جلد

[1] اورنٹل کالج میگزین، لاہور، فروری ۱۹۳۰ء

تقرب پایا۔ اس کے بعد برہان شاہ اور پھر عبدالرحیم خان خاناں کی قربت حاصل کی۔ عبدالرحیم خان نے نہ صرف اِن کے حق میں مستقل وظیفہ مقرر کیا بلکہ زمین کا ایک ٹکڑا بھی دے دیا۔ عبدالرحیم خان نے ہی مولوی محمد علی کشمیری کو ایک عربی کتاب "علامتہ العلامتہ" کا فارسی ترجمہ کرنے پر مامور کیا جسے اُنھوں نے انجام دیا تھا۔ عبدالرحیم خان نے یہ ترجمہ پسند کر کے مترجم کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ مولوی محمد علی کا انتقال ۱۵ ربیع الاوّل ۱۰۲۵ھ کو ہوا۔

حلّ المُعلقات: مولانا ابوالحسن کشمیری یہ شرح ایک مہاجر کشمیری عالم مولوی ابوالحسن بن نقی شاہ کشمیری کے قلم سے ہے۔ شارح ممدوح نے لکھنو میں ادب اور معقولات کے بلند مرتبہ عالم اور مدرس کی حیثیت سے بڑی ناموری حاصل کی تھی۔ مولانا عبدالحی صاحب حسنی نے "سبع معلقات" کے پانچ ہندوستانی شارحین کا ذکر کیا ہے جن میں مولوی ابوالحسن صاحب کی شرح بھی شامل ہے۔ اس شرح کا پورا نام "حل المعلقات فی حل سبع المعلقات" ہے[2]۔ علم کلام میں بھی ان کی ایک مستقل علمی یادگار ہے[3]

---

[1] مآثر رحیمی: ج ۳ ص ۵۸ تا ۵۹ : مطبوعہ بنگال

[2] الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند : ص ۵۶

[3] الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند : ؍؍

صرف ونحو

الزُّبُدَۃ فی النحو: محمد الکشمیری محمد حسن بن عبداللہ کشمیری اثنا عشری فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ فقہ اور نحو کے سرکردہ عالم تھے۔ آخری عمر میں حائر میں مستقل قیام کیا تھا۔ آپ کے اساتذہ میں حسین فاضل اردکانی اور مُلاّ محمد تقی ہراتی کا نام ملتا ہے جو اپنے زمانے اور اپنے علاقے کے مشہور علماء تھے۔ محمد بن حسن کی علمی یادگاروں میں الزُّبُدَۃ فی النحو کا ذِکر ملتا ہے۔ ۶ صفر ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۹۱۰ء انتقال کیا۔[۵]

منظوم قافیہ: مصطفیٰ خان بختور مُلاّ عبید اللہ کشمیری کے فاضل شاگردوں میں سے تھے۔ علامہ ابن حاجب کی کافیۃ کا عربی میں نظم کا جامہ پہنایا تھا۔

حاشیہ علیٰ شرح الجامی: مُلاّ محمد محسن کھشو یہ علامہ محمد محسن کا علمی کرشمہ ہے جو اب نایاب ہے۔

حاشیہ علیٰ شرح الجامی: مُلاّ نور الدین کنٹھ مُلاّ صاحب کا ذکر بیان وبلاغت پر لکھی ہوئی کتابوں میں پہلے بھی آیا ہے۔ مُلاّ جامی کی کتاب پر ان کی یہ عالمانہ شرح

---

[۱] الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند: ص ۵۶

[۵] معجم المؤلفین: عمر رضا کحالہ: ج ۹ ص ۱۹۷، دمشق: ۱۳۸۱ھ

شائع بھی ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر زبید احمد نے بھی اس کا ذکر کیا ہے[۱]

منتخبات

المنتخبات العربیۃ : مولوی محمد حسن کشمیری انتخاب و اختیار ادب کا ایک مستقل شعبہ ہے۔ مولانا عبدالحی حسنی نے فنونِ ادب میں علمائے ہند کی تصانیف کے ضمن میں مذکورہ انتخاب کا بھی ذکر کیا ہے[۲]

ادب العرب : مولانا ثناء اللہ امرتسری یہ کتاب مشہور مناظرِ اسلام مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کشمیری کی تصانیف میں شامل ہے۔ مولانا عربی کے اچھے عالم اور مصنف تھے۔ یہ کتاب آج سے اسّی سال قبل مطبع اہلحدیث امرتسر سے شائع ہوئی تھی۔ احقر کو تلاش بسیار کے باوجود نہ ملی۔

منہاج الادب : پروفیسر محی الدین حاجنی یہ کتاب متعدد علمی، ادبی اور مذہبی کتابوں کے اقتباسات کا عمدہ مجموعہ ہے اور عربی لٹریچر کے سارے ادوار پر محیط ہے۔ اس میں قرآنِ حکیم، حدیث، فقہ، امثال و حِکَم، قصص و حکایات، مکالمات، خطبات کے نمونے جمع کئے گئے ہیں۔ ادبِ عربی سے تعلق رکھنے والے طلباء کے لئے یہ کتاب بے حد فائدہ بخش ہے۔

---

[۱] THE CONTRIBUTION OF INDIA TO ARABIC LITERATURE BY DR. ZUBIAD AHMED 1 P. 563

[۲] الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند: ص: ۵۳ مطبوعہ دمشق۔

مکاتیب

عربی لٹریچر میں خطوط نگاری ایک مستقل فن ہے۔ کشمیر میں حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ پہلے عالم ہیں جن کے تحریری سرمایہ میں عربی اور فارسی میں لکھے ہوئے چند خطوط ملتے ہیں جو انہوں نے اپنے زمانے کے چند سرکردہ ارباب سیاست و امارت کے نام تحریر کئے تھے۔ اِن کے بعد ہمیں کسی دوسرے عالم کی اِس فن کی کوئی یادگار دستیاب نہیں ہوئی۔ اِس وقت میرے سامنے عربی خطوط کے دو مجموعے ہیں۔ اِن میں ایک مجموعہ ایک جلیل القدر کشمیری الاصل عالم کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے جبکہ دوسرا مجموعہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا لکھا ہوا ہے مگر اس کی جمع و ترتیب کا کام ان کے ایک کشمیری شاگرد نے انجام دیا ہے۔

سندھ کے ایک بلند مرتبہ عالم اور محدث مولانا معین الدین سندھیؒ نے حافظ تقی الدین ابن تیمیہ حرّانیؒ کے محامد اور نقائص کے بارے میں شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ سے اِستفسار کیا تھا اور شاہ صاحب نے خطوط کے ذریعہ ابن تیمیہؒ کے محامد اور فضائل بیان کئے تھے۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کی وضاحت سے مولانا سندھیؒ مطمئن ہوئے تھے یا نہیں تاہم شاہ صاحبؒ کے نامی گرامی فرزند حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کا حضرت حافظ ابن تیمیہؒ کے ساتھ آخر تک علمی اختلاف برقرار رہا۔ اپنے ایک فتویٰ میں حافظ ابنِ تیمیہؒ کی بعض باتیں ردّ کرتے

ہوئے اپنے والدِ بزرگوار اور مولانا معین الدین سندھی کی مراسلت کا حوالہ بھی دیا ہے، لکھتے ہیں:۔

ثمّ ابن القیم تلمیذہٗ الرّشید قد بالغ فی توجیہ کلامہٖ لکن لم یقبلہ العلماء حتیٰ انّ المخدوم معین الدّین السندھی فی عصر سیّدی الوالد اطال رسالۃ فی ردّہٖ[1]

ابن تیمیہؒ کے شاگردِ رشید حافظ ابن قیّم نے ان کی بعض باتوں کی توجیہہ نکالنے میں بڑی کوشش کی مگر علماء نے اسے قبول نہیں کیا۔ یہاں تک کہ مخدوم معین الدین سندھی نے حضرت والد صاحب (شاہ ولی اللہ صاحبؒ) کے زمانہ میں ابن تیمیہؒ کی ردّ میں ایک طویل رسالہ بھی لکھا۔

شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ کے یہ خطوط (بنام مولانا معین الدین سندھی) مولانا محمد امین کشمیری نے مرتب کئے جو شاہ ولی اللہ صاحب کے محبوب ترین شاگرد تھے اور جنہوں نے اپنے عظیم المرتبت استاد کی کئی اور علمی کتابیں مرتب کی تھیں۔ ہم نے ان کے حالاتِ زندگی اور علمی شان نیز ولی اللہی خانوادے سے ان کے گہرے تعلق پر اس کتاب کے حصۂ اوّل میں قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

دوسرا مجموعہ مکتوبات مولانا رشید الدین خان صاحب دہلوی کشمیریؒ کا ہے

---

[1] "فتاویٰ عزیزیہ" ج ۲ ص: ۷۷

مکاتیب

عربی لٹریچر میں خطوط نگاری ایک مستقل فن ہے۔ کشمیر میں حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ پہلے عالم ہیں جن کے تحریری سرمایہ میں عربی اور فارسی میں لکھے ہوئے چند خطوط ملتے ہیں جو اُنہوں نے اپنے زمانے کے چند سرکردہ ارباب سیاست و امارت کے نام تحریر کئے تھے۔ اِن کے بعد ہمیں کسی دوسرے عالم کی اس فن کی کوئی یادگار دستیاب نہیں ہوئی۔ اِس وقت میرے سامنے عربی خطوط کے دو مجموعے ہیں۔ اِن میں ایک مجموعہ ایک جلیل القدر کشمیری الاصل عالم کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے جبکہ دوسرا مجموعہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا لکھا ہوا ہے مگر اس کی جمع و ترتیب کا کام ان کے ایک کشمیری شاگرد نے انجام دیا ہے۔

سندھ کے ایک بلند مرتبہ عالم اور محدّث مولانا معین الدین سندھیؒ نے حافظ تقی الدین ابن تیمیہ حرّانیؒ کے محامد اور نقائص کے بارے میں شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ سے اِستفسار کیا تھا اور شاہ صاحب نے خطوط کے ذریعہ ابن تیمیہؒ کے محامد اور فضائل بیان کئے تھے۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کی وضاحت سے مولانا سندھیؒ مطمئن ہوئے تھے یا نہیں تاہم شاہ صاحبؒ کے نامی گرامی فرزند حضرت شاہ عبد العزیز محدّث دہلویؒ کا حضرت حافظ ابن تیمیہؒ کے ساتھ آخر تک علمی اختلاف برقرار رہا۔ اپنے ایک فتویٰ میں حافظ ابنِ تیمیہؒ کی بعض باتیں ردّ کرتے

ہوئے اپنے والدِ بزرگوار اور مولانا معین الدین سندھی کی مراسلت کا حوالہ بھی دیا ہے، لکھتے ہیں :-

ثمّ ابن القیم تلمیذہٗ الرّشید قد بالغ فی توجیہ کلامہ لکن لم یقبلہ العلماء حتیٰ انّ المخدوم معین الدّین السندھی فی عصر سیّدی الوالد اطال رسالۃ فی ردّہ[1]

ابن تیمیہؒ کے شاگردِ رشید حافظ ابن قیم نے اِن کی بعض باتوں کی توجیہہ نکالنے میں بڑی کوشش کی مگر علماء نے اِسے قبول نہیں کیا۔ یہاں تک کہ مخدوم معین الدین سندھی نے حضرت والد صاحب (شاہ ولی اللہ صاحبؒ) کے زمانہ میں ابن تیمیہؒ کی ردّ میں ایک طویل رسالہ بھی لکھا۔

شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ کے یہ خطوط (بنام مولانا معین الدین سندھی) مولانا محمد امین کشمیری نے مرتب کئے جو شاہ ولی اللہ صاحب کے محبوب ترین شاگرد تھے اور جنہوں نے اپنے عظیم المرتبت استاد کی کئی اور علمی کتابیں مرتب کی تھیں۔ ہم نے اِن کے حالاتِ زندگی اور علمی شان نیز ولی اللّٰہی خانوادے سے اِن کے گہرے تعلق پر اِس کتاب کے حصۂ اوّل میں قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

دوسرا مجموعۂ مکتوبات مولانا رشید الدین خان صاحب دہلوی کشمیریؒ کا ہے

[1] "فتاویٰ عزیزیہ" ج ۲ ص: ۷۷

وہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد رشید، بلند مرتبہ عالم، مصنّف اور مُناظر و مُتکلم تھے۔ گو ان کا اصل میدانِ تحقیق "معقولات" تھا، تاہم اُنھوں نے ایک بلند پایہ ادیب کی حیثیت سے بھی نام پیدا کیا تھا۔ مولانا عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی بنا پر انہیں ہندوستان کے عربی ادباء کی فہرست میں بھی جگہ دی ہے[1] ان کے مطبوعہ مجموعۂ مکاتیب میں دیباچہ نگار نے انہیں ان القاب سے یاد کیا ہے :۔

"الامام الهمام استاد الاساتذة الكرام، الساحب على البديعي والحريري ذيول النسيان مولانا المولوى رشيد الدين خان "[2]

حق یہ ہے کہ اس مجموعے سے ہی عربیّت میں ان کی مہارت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس میں ان کے ۱۷ مبسوط خطوط ہیں جو اُنھوں نے اپنے ایک دوست احمد بن محمد الانصاری الیمنی الشروانی کے نام لکھے ہیں۔ اس میں مکتوب الیہ کے جوابات بھی شامل ہیں۔ ان سترہ[17] خطوط کے علاوہ اس میں ایک تقریظ بھی موجود ہے جو مکتوب الیہ (شیخ احمد الانصاری الیمنی) کی شرح بانت سعاد پر عربی میں لکھی گئی ہے یہاں ہم ان کے ایک مکتوب کی

---

[1] "الثقافة الاسلامية فى الهند" : ص ۱۱۳

[2] "۲ لمکاتیب" مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۳۵ء : ص ۱

چند ابتدائی سطور درج کرتے ہیں، یہ مکتوب انہوں نے اپنے نامور ہم وطن اور اُستاد بھائی مولانا صدر الدین خان آزردہ دہلوی کشمیری کو لکھا ہے:-

أسرب القطا هل من يعير جناحه
لعلّي الى مَن قد هَويتُ أطير

من جوّى أوقدة البعد و شجيّ أكمدة الوجد، الى جانب الحبيب الّذي تنزّة قدحهٔ المعلّى عن القدح والنسيب الّذى استوعب نسبة صنوف المدح الّذى اذا نظم خجل قلائد الفلائد و اذا نثر غبط الفرائد، ذو خلق عظيم و طبع كريم و سجيّةٍ سريّةٍ وهمةٍ عليّة، ما من علم إلّا أصاب مشكلاته وما مِن فنٍّ إلّا غاص في بحار تحقيقاتهٖ ۔ امّا الأدب فقد شيّدَ أركانه، وامّا الفقه فقد أبرمَ بنيانه، واما المعقول فمنادٌ اليه ومعوّلُ أرباب الصناعة إليه ... " الخ

لغت

محیط اللغات: مہاراجہ رنبیر سنگھ حکمرانِ کشمیر کے سرکردہ درباری علماء میں مرزا اکبر کشمیری ایک عالم بھی تھے ۔ ہم نے اِس کتاب کے ابتدائی صفحات میں مہاراجہ کی قدر ے علم دوستی اور قائم کئے ہوئے دار الترجمہ کا ذکر کیا ہے ۔

زیرِ تعارف کتاب ترتیب دینے کا باعث یہ ہوا کہ ایک بار مہاراجہ جموں سے کشمیر وارد ہوا۔ بڑے بڑے شعراء اور ادبا اس کے دربار میں حاضر ہوئے اور ہر ایک نے اپنا بیان اور کلام نذرانے کے طور پر پیش کیا۔ مرزا اکبر نے اپنی طرف سے زیرِ تعارف کتاب پیش کی تھی۔ یہ کتاب نو رسائل پر مشتمل ہے:-

۱۔ رسالۂ اصطلاحات۔

۲۔ دربیانِ حروفِ تہجی۔

۳۔ دربیانِ تشبیہات و مناسبات۔

۴۔ دربیانِ اصطلاحاتِ علمِ موسیقی۔

۵۔ دربیانِ اصطلاحاتِ علمِ نجوم۔

۶۔ دربیانِ امثلۂ فارسی۔

۷۔ دربیانِ علمِ قافیہ۔

۸۔ دربیانِ علمِ عروض۔

۹۔ لغت: عربی، فارسی، ترکی۔

اس عظیم الشان کتاب کے ساتھ جو بڑی تقطیع کے نو سو سے زیادہ صفحات پر پھیلی ہوئی تھی، آج تک کسی نے اعتنا نہیں کیا ہے اور شاید اس کتاب کے یہ تعارفی الفاظ لکھنے کی نوبت بھی آج ہی آئی ہے۔ یہ نسخہ مؤلف کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور کتابت کی خوبصورتی اور زیب و زینت کا بھی لحاظ رکھا ہے۔

ڈاکٹر زبید احمد صاحب نے بلاغت و بیان کی کتابوں میں امیر خسرو کی فارسی کتاب اعجازِ خسروی کو بھی اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ اس اعتبار سے

ل CONTRIBUTION OF INDIA TO ARABIC LITERATURE P. 176

موجودہ کتاب عربی سے ہی تعلّق رکھتی ہے، ان میں آخری رسالہ زیادہ اہم ہے اور بدرجۂ اتم عربی سے تعلّق رکھتا ہے۔

یہ رسالہ ایک مختصر لغت ہے جس میں فارسی اسماء کا عربی اور ترکی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ لغت میں حروف تہجی کی ترتیب کا خیال رکھا جاتا ہے جبکہ زیر بحث رسالے میں اسماء کو تقسیم کر کے ایک خاص ترتیب میں پیش کیا گیا ہے جیسے جسمانی اعضاء کے اسماء، اسماءِ بقول، اسماءِ آلات و اسباب وغیرہ۔

اسماءِ آلات و اشخاص میں چند اسماء بطورِ مثال پیش کئے جاتے ہیں:۔

عربی	فارسی	ترکی
مِسْحَتہ	پیل	ترش
مِخْیَط	سوزن	الکیز
مُشْط	شانہ	تراق
صَحْن	قاب	بشقاب
عَبا	چوغہ	چوغا
قَلَنسُوۃ	کلاہ	بیاق
اشہب	اسپ	شولک
مِقْرَعَۃ	تازیانہ	قمچی
تَسلیم	نیاز	کورنش
صَوْلَۃ	حملہ	یورش

•••••

کتابیات

عربی، فارسی اور اردو

۱۔ آثار الصنادید : سر سید احمد خان مرحوم

۲۔ آئینِ اکبری : ابو الفضل علامہ

۳۔ اتحاف النبلاء المتقین باحیاءِ مآثر الفقہاء والمحدثین :
نواب صدیق حسن خان مرحوم

۴۔ الاحکام السلطانیۃ : علامہ ماوردی

۵۔ استاذ العلماء : مولانا نواب حبیب الرحمان خان شروانی

۶۔ اسرار الابرار (قلمی) شیخ داؤد مشکواتی محدث کشمیری

۷۔ الاغانی : ابو الفرج الاصفہانی

۸۔ اکفار الملحدین فی شیءٍ من ضروریات الدین :
علامہ محمد انور شاہ کشمیری رح

۹۔ الانصاف فی بیان طریقۃ النجاۃ (قلمی) : شیخ حبیب اللہ نوشہری۔

۱۰۔ انوار الباری شرح صحیح البخاری : (مقدمہ) : مولانا احمد رضا بجنوری

۱۱۔ الانور : عبد الرحمان صاحب کوندو

ب

۱۲۔ بہارستانِ شاہی (قلمی)

۱۴۔ بحر العرفان : مرزا اکمل الدین خان بدخشی۔

ترتیب وتدوین : حبیب اللہ صاحب کاملی مرحوم

ت

۱۵۔ تاج العارفین شرح ورد المریدین : مولانا سید محمد قاسم شاہ بخاری صاحب۔

۱۵۔ تاریخ الآداب العربیۃ : احمد حسن الزیات

۱۶۔ تاریخِ اعظمی : محمد اعظم دیدہ مری

۱۷۔ تاریخِ اقوامِ کشمیر : منشی محمد الدین فوق مرحوم

۱۸۔ تاریخِ حسن : مولوی غلام حسن کھویہامی مرحوم

۱۹۔ تحلیل الذبائح : علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ

۲۰۔ تاریخِ کبیر : مولوی محی الدین مسکین

۲۱۔ تذکرۂ شعرائے کشمیر : حسام الدین راشدی صاحب

۲۲۔ تذکرۂ علماءِ ہند : مولوی رحمان علی مرحوم

پ

۲۳۔ پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ : پروفیسر ظہور الدین احمد

ث

۲۴۔ الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند : مولانا عبدالحی حسنی

ح

۲۵۔ حسن العزیز : مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

خ

۲۶۔ خزینۃ الاصفیاء : مفتی غلام سرور لاہوری

د

۲۷۔ دربارِ اکبری : مولانا محمد حسین آزاد

۲۸۔ دستور السالکین شرح ورد المریدین : علامہ شیخ داؤد خاکیؒ

۲۹۔ دیوان ابن الفارض : خلیل الخوری

س

۳۰۔ سواطع الالہام : ابو الفیض فیضی
۳۱۔ سوانح حضرتِ بابا داؤد خاکی : مفتی محمد شاہ سعادت مرحوم
۳۲۔ سیف الدین تارہ بلی (بزبان کشمیری) : ڈاکٹر مشعل سلطانپوری

ش

۳۳۔ شرح عین العلم : علّامہ محمد محسن کھشو کشمیری
۳۴۔ شرح محیط الدائرۃ : مولانا سید میرک شاہ صاحب اندرابی

ظ

۳۵۔ ظفر اللاضی بما یجب من القضاء علی القاضی : نواب سید صدیق حسن خاں مرحوم
۳۶۔ ظہر الاسلام : ڈاکٹر احمد امین مصری

ف

۳۷۔ فتاوی عزیزیہ : مولانا شاہ عبد العزیز محدّث دہلوی
۳۸۔ فتحات کبرویہ : شیخ عبد الوہاب نوری
۳۹۔ فہرستِ کتب خانۂ رامپور

ک

۴۰۔ کشمیری زبان اور شاعری : عبدالاحد آزاد مرحوم
۴۱۔ کشمیر میں اسلام کی اشاعت : محمد فاروق بخاری
۴۲۔ کشمیر میں عربی علوم کی اشاعت (ج ا) : محمد فاروق بخاری
۴۳۔ کلام شیخ العالم : شائع کردہ مکتبۂ علم و ادب سرینگر۔
۴۴۔ کلیات غالب (فارسی) : لاہور ایڈیشن۔

م

۴۵۔ معجم الاُدباء : یاقوت الحموی الرّومی
۴٦۔ مغازی النبیؐ : حضرت شیخ یعقوب عاصی صرفی
۴۷۔ منتخب التواریخ : مُلّا عبدالقادر بدایونی
۴۸۔ مآثر رحیمی : مُلّا عبدالقادر نہاوندی
۴۹۔ المکاتیب : مولانا رشیدالدین خان دہلوی کشمیری۔
۵۰۔ محیط اللّغات (قلمی) : مرزا اکبر کشمیری
۵۱۔ (علامہ) محمد انور شاہ کشمیری : شخصیت اور علمی کمالات
محمد فاروق بخاری

ن

۵۲۔ نُزُل مَن اتقٰی (مقدمہ) المنتقی لابن تیمیہ :
مولانا عبدالرشید شوپیانی کشمیری

۵۳۔ نفحۃ العنبر مِن ھدی الشیخ الانور : علامہ محمد یوسف بنوریؒ

۵۴۔ نُزھۃُ الخواطِر وبَھجۃُ المسامِعْ والنَّواظِرْ
تالیف
مولانا سید عبدالحی حسنی رائے بریلوی

انگریزی ماخذ

1. THE CONTRIBUTION OF INDIA TO ARABIC LITERATURE
BY. DR. ZUBAID AHMED

2. CULTURAL HERITAGE OF KASHMIR : SURESH CHANDER.

3. KASHIR . A HISTORY OF KASHMIR : DR. G. M. D SUFI

4. KASHMIR UNDER THE SULTANS : PROF. MOHIBUL HASSAN.

5. RAJTARANGNI : JONARAJA : ENG: TR BY : DUTT.

6. SRINAGAR : DR. ISHAQ KHAN

7. TARIKH-I-RASHIDI ENG. TR. BY. ELIAS + DENISON ROSS

8. THE VALLEY OF KASHMIR : W.R. LAWRANCE.

مجلّات وجرائد

۱۔ معارف (اعظم گڑھ) بابت ۱۹۲۸ء
۲۔ برہان (دہلی) بابت ۱۹۵۴ء
۳۔ الجمعیۃ (دہلی) شیخ الاسلام نمبر
۴۔ ثقافۃ الہند (دلی) بابت ۱۹۵۵ء/۱۹٦٦ء
۵۔ اورنٹل کالج میگزین، لاہور بابت ۱۹۳۰ وغیرہ۔
٦۔ JOURNAL OF THE ROYAL ASIATIC SOCIETY OF BENGAL, 1885.